عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

# طلوعِ اسلام

زیرِ ادارت سید نذیر نیازی

خاص عنوانات

## احمدیت اور اسلام

(باضافۂ بیانات سابقہ)

از حضرت علامہ اقبال مدظلہ

## سیاحت اندلس

از مولوی غلام یزدانی ایم۔اے ناظم آثار قدیمہ دولت آصفیہ

اچھوتوں میں تبلیغ اسلام

زبان کا اثر مذہب پر از محمد اسد خاں

منظور (افسانہ) از سید نصیر احمد

اور

علامہ اقبال کی ایک نظم


قیمت سالانہ پانچ روپئے

مارچ ۱۹۳۶

فی پرچہ آٹھ آنے

طلوع اسلام میں اشتہار دینا عقلمندی کی دلیل ھے

کیونکہ

## طلوع اسلام

ھر مہذب ملک کے بہترین اور ذی اثر طبقے کے مطالعہ میں آتا ھے

### شرح اجرت اشتہارات

| | | |
|---|---|---|
| فی صفحہ | ایک بار | دس روپئے |
| نصف صفحہ | " | چھہ روپئے |
| چوتھائی صفحہ | " | تین روپئے |

کمیشن اور دوسرے امور کیلئے مہتمم سے خط و کتابت کیجائے

## ذیابیطس

شکایات صدر،
امراض مزمنہ
اور
اعادۂ شباب
کیلئے
مجھے رجوع فرمائیے
حکیم حسین احمد عباسی

روھتک روڈ
قرول باغ - نئی دھلی
ھر مرض کا مکمل علاج،
خط و کتابت محفوظ
قیمتیں کم اور ادویات عمدہ

## محمد صدیق محمد عمر

ایکسپورٹ اینڈ امپورٹ ایجنٹس - بازار بلیماران - دھلے

ٹیلیفون نمبر—۵۵۹۸ ☆ تار کا پتہ—« الجلیل » دھلے

ھر قسم کے ایکسپورٹ اور امپورٹ بالخصوص کپڑے اور بساط خانے کیلئے اس قابل اعتماد فرم سے فائدہ اٹھائیے -

# طلوع اسلام

ایک ماہوار رسالہ مشتمل بر حیات ملیہ اسلامیہ

جلد ۱ — مارچ ۱۹۳۶ء — عدد ۳


## طلوع اسلام لاہور میں

دس مارچ کو طلوع اسلام کا دفتر دہلی سے لاہور منتقل ہو جائیگا
لہذا آئندہ خط و کتابت اس پتہ سے ہو۔

مہتمم مجلہ طلوع اسلام - ۲۵ میکلوروڈ۔ لاہور

طلوع اسلام۔ ہر مہینے کی چوتھی یا پانچویں تاریخ کو پوسٹ کر دیا جاتا ہے اگر قارئین کو کسی وجہ سے پرچہ نہ ملے تو مہینے کے تیسرے ہفتہ تک دفتر کو اطلاع کر دیجئے تاکہ دوسرا پرچہ آپ کی خدمت میں بھیجدیا جائے ورنہ شاید تعمیل نہ ہو سکے۔


چندہ سالانہ پانچ روپے — ششماہی تین روپے — فی پرچہ آٹھ آنے

طابع و ناشر سید نذیر نیازی

جید برقی پریس بلیماران دہلی میں چھپکر دفتر طلوع اسلام قرولباغ نئی دہلی سے شائع ہوا۔

# فہرست مضامین

جلد ۱ | مارچ ۱۹۳۶ء | عدد ۳

تکلف برطرف ... ۳
شذرات
مشورے اور گفتگوئیں | محض اعلانات | ہیئت ملیہ | ۶

نظم
شاعر | حضرت علامہ اقبال مدظلہ | ۵
حرف شکایت | حضرت میکش | ۱۱
پیام مشرق | ادیب شہیر ایران ڈاکٹر افشار | ۳۱
مقالات
زبان کا اثر مذہب پر | محمد اسد خاں بی۔اے | ۱۲
پست ماندگان ہند میں تبلیغ اسلام | راغب احسن ایم۔اے | ۱۸
سیاحت اندلس | مولوی غلام یزدانی ناظم آثار قدیمہ دولت آصفیہ
افسانہ ــــ منظور | سید نصیر احمد بی۔اے | ۲۶
تنقید و تبصرہ ــــ صحیح بخاری | نقش خیتائی | حقیقت اسلام | ندیم
ضمیمہ
احمدیت اور اسلام (باضافہ) | حضرت علامہ اقبال مدظلہ

# تکلف برطرف

طلوع اسلام کی یہ اشاعت صرف مقالات اور ایک طویل ضمیمے پر مشتمل ہے۔ بحث و نظر اور تاریخ و سیاست کا حصہ اس مرتبہ روک لیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ حضرت علامہ اقبال مدظلہ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے استفسارات کا جواب دیتے ہوئے، اسلام اور احمدیت، پر جس انداز میں بحث فرمائی ہے اس کا اردو ترجمہ قارئین طلوع اسلام تک پہنچا دینا ضروری تھا۔ علامہ ممدوح کا پہلا بیان اور انکی بعض تحریریں جو قادیانی نزاع کے متعلق وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں ضمیمے میں بڑھا دی گئی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ حقائق و معارف کے اس لطیف مجموعے کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین کو "تاریخ و سیاست" کی مزید جستجو کا خیال نہیں رہے گا کیونکہ تحریک احمدیت بجائے خود ایک تاریخی اور سیاسی مسئلہ ہے جس سے اسلامی سیاسیات میں بعض نہایت ہی ضروری اور اہم مباحث کا آغاز ہو گیا ہے۔

رسالے کے باقی مضامین کے متعلق ہمارا کچھ عرض کرنا شاید مناسب نہ ہوگا۔ البتہ ہمارے دوست جناب محمد اسد خاں صاحب نے "زبان کا اثر مذہب پر" کہلاتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ غیر زبانوں میں مخصوص اسلامی اصطلاحات کی ترویج ضروری ہے اگر یہ صحیح ہے تو فصحائے اردو کے متعلق انکی کیا رائے ہے جن کا شوق سلاست پسندی انھیں قرآن پاک کے ترجمہ و تحشیہ اور دینیات میں بھی "صاف و سادہ" الفاظ کے استعمال پر مجبور کرتا ہے۔ ہماری رائے میں عربی اور اسلامی ادب سے مسلمانان ہند کی ناواقفیت کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ اور یہی وجہ ہے ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کے متعلق ان غلط سلط بحثوں کی جو مغربی افکار کے زیر اثر آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ اردو کو "ہندوستانی" قالب میں ڈھالنے کی جو کوششیں اسوقت ہو رہی ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے یہ مسئلہ اور بھی اہم ہو جاتا ہے ہمیں امید ہے جناب اسد صاحب اس موضوع پر بھی اظہار خیال فرمائیں گے۔

ہمارے بھائی راغب احسن صاحب جنکا ایک اہم مضمون بعنوان "پست ماندگان ہند میں تبلیغ اسلام" قارئین اس اشاعت میں ملاحظہ کرینگے انگریزی الفاظ کے استعمال پر معذرت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لفظ پلان Plan جدید فارسی میں رائج ہے۔ بہت بہتر لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ راغب صاحب شاید سہولت فہم

کے لئے اکثر انگریزی اصطلاحات سے بلا تکلف فائدہ اُٹھاتے ہیں معلوم نہیں خود راغب صاحب کی اس کے متعلق کیا رائے ہے ہاں پرویز صاحب سے انہیں ایک شکایت ہے اور وہ یہ کہ ان کا امریکہ کے سابق صدر مسٹر ہوور کے بیانات سے یہ استدلال کرنا کہ ان لوگوں کی اجتماعی زندگی اخلاقی اعتبار سے نہایت پست ہے صحیح نہیں کیونکہ انتخاب کی مہموں پر اس قسم کی طعن آمیز تحریریں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کیا فرماتے ہیں پرویز صاحب بیچ اس مسئلہ کے ؟ راغب صاحب کو صرف انکی "سند" پر اعتراض ہے نفس مضمون سے کوئی اختلاف نہیں

کچھ دن ہوئے ہمارے ایک دیرینہ کرم فرما نے طلوع اسلام کی ترتیب اور روش کے متعلق چند ضروری مشورے دیتے ہوئے یہ اعتراض کیا تھا کہ ایک "ملی اور اسلامی" مجلے کو "ادبی تشخیص" سے کیا تعلق ؟ اس پر جب ہم نے ان کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ وہی جو ملت اسلامیہ کو ادب سے ہے" تو وہ فرمانے لگے کہ "خیر ایسا ہی سہی۔ لیکن اس میں سرشار کا ذکر کیوں آیا ہے ؟" بات معقول تھی اور ہم خاموش ہو گئے مگر کچھ دنوں کے بعد جب ہمارے ایک بزرگ نے اس واقعہ کو سُنا تو ہنسکر کہنے لگے۔ کیا مضائقہ ہے۔ سرشار بھی تو آخر ترکی ٹوپی لگایا کرتے تھے۔ اس اشاعت میں بھی ہم اپنے عزیز دوست جناب میکش کی ایک فارسی نظم (یا غزل) "حرفِ شکایت" کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں۔ خدا نہ کرے اس کے متعلق کسی کو شکایت پیدا ہو۔ ان صاحب کو بھی جن سے "حرفِ شکایت" میں خطاب کیا گیا ہے۔ کیونکہ میکش صاحب کو اصرار ہے کہ انکی شکایات کا تعلق فی الواقعہ سیاسیات ہی سے ہے، محبت کی سیاسیات سے نہیں۔

جیسا کہ شروع میں اعلان کر دیا گیا ہے اس اشاعت کے ساتھ طلوع اسلام کا دفتر دہلی سے لاہور منتقل ہو جائیگا۔ اس لئے نہیں کہ دہلی کی آب و ہوا طلوع اسلام کو ناسازگار تھی —— دہلی سے ہمیں جو تعلق ہے وہ انشاء اللہ اب بھی قائم رہے گا —— بلکہ اس لئے کہ جو مقاصد اسکے پیش نظر ہیں ان کے لئے کچھ پنجاب کی سرزمین ہی جسے بجا طور پر "اسلامی ہندوستان" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ موزوں ثابت ہوگی۔ ہم نے اگرچہ اس امر کا مکمل انتظام کر لیا ہے کہ طلوع اسلام کا آئندہ پرچہ ٹھیک ۱۴ اپریل کو شائع ہو جائے لیکن اگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکے تو قارئین کرام چند دنوں کی تاخیر کا خیال نہ فرمائیں۔

مدیر

---

طلوع اسلام
مارچ
۱۹۴۶

# شاعر

حضرت علامہ اقبال کی یہ نظم رسالہ اردو میں شائع ہوئی تھی جسے ہم معاصر موصوف کا دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے طلوع اسلام میں نقل کر رہے ہیں — مدیر

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس تیرے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے

تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی مے

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

---

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

# شذرات

## مشورے اور گفتگوئیں

وسط فروری میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس دہلی میں منعقد ہوا ہز ہائنس سر آغا خاں صدر تھے۔ ہندوستان کی اسلامی سیاسیات پر ایک مکمل اور مبسوط تبصرہ فرماتے ہوئے انھوں نے کہا:-

## عید مبارک

"ہماری (یعنی ہندوستان کی) معاشی، اجتماعی اور دینی حالت فوری اصلاح کی محتاج ہے۔ ہمیں کمزوروں کی دستگیری کرنا ہے... مذہب کا تعلق افراد کے اپنے عقیدے سے ہے۔ اس کو ہندوستان کی مختلف جماعتوں میں نفرت اور دشمنی کا سبب نہیں بننا چاہیئے۔ اسلام رواداری سکھلاتا ہے اور ہندوستان کے آئندہ سیاسی تغیرات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہز ہائنس نے جو مشورہ مسلمانوں کو دیا اس کی تفصیل یہ ہے۔

ہمارا لائحہ عمل اصلاح ہے۔ اپنی ذات کی اصلاح، روحانی، اخلاقی، ذہنی اور معاشی اصلاح۔ صرف افراد کی نہیں، خاندانوں کی نہیں، بلکہ غریبوں کی اصلاح جمہور کی اصلاح، محتاجوں اور پست ماندوں کی اصلاح خواہ ان کا تعلق کسی مذہب سے ہو... اس عظیم الشان خدمت کو انجام دیتے ہوئے ہمیں مذہب و ملت کی تفریق

کا مطلق خیال نہیں ہونا چاہئے۔"

کانفرنس کے انعقاد سے ایک روز پہلے ایسوشی ایٹڈ پریس کی معرفت یہ سننے میں آیا تھا کہ ارباب کانفرنس اس امر کا اعلان چاہتے ہیں کہ مسلمانان ہند اپنے ملک یعنی "مادر وطن" کا خیال مقدم رکھیں... ان کو چاہئے کہ اپنی مخصوص اور منفرد ملی زندگی کے استحکام میں مذہب یا مذہبی جذبات سے کام نہ لیں... مسلم سیاستین کو ایک لائحہ عمل "معاشی خطوط" پر وضع کرنا چاہئے جس پر عمل کرتے ہوئے وہ بلا امتیاز مذہب و ملت ان جماعتوں سے متحد ہو جائیں جن کے پیش نظر یہی مقاصد ہیں

اس کے کچھ دنوں بعد میاں سر فضل حسین کے زیر اثر (بحوالہ اسٹیٹسمین، اشاعت فروری ۱۸-۶۳۶) ایک رسالہ "سیاسیات پنجاب" کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس میں پنجاب کی ملی اور بین الملی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے جو نتائج قائم کئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "اہل پنجاب کا نزاع خواہ اس کا تعلق کسی ایک کوم یا مختلف قوموں کے باہمی مناقشات سے ہو سرتاسر سیاسی ہے مذہب کو اس میں کوئی دخل نہیں۔"

پھر انہی ایام میں جب ہز ہائنس سر آغا خاں دہلی تشریف لائے ہیں تو روزنامہ اسٹیٹمین (اشاعت فروری ۲۰) میں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ معلوم ہوا ہے "ہز ہائنس سر آغا خان اور میاں سر فضل حسین نے دو مرتبہ مسٹر ڈیسائی سے گفتگو کی ہے۔ اس تبادلہ خیالات کا مطلب غالباً یہ ہے کہ ایک معاشی لائحہ عمل کی بناپر اتحاد عمل کی کوئی صورت نکل آئے۔ یہ بھی دیکھنا ہے کہ مشترکہ نیابت کا اصول اختیار کیا جا سکتا ہے یا نہیں مسلمان اس کے حق میں ہیں بشرطیکہ ایسا کرتے ہیں انکے تناسب آبادی کا صحیح طور پر اظہار ہو سکے اس کے ساتھ ہی یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ ممکن ہے مارچ میں جب گاندھی جی دہلی تشریف لائیں تو اس وقت یہ گفتگوئیں زیادہ عملی شکل اختیار کر سکیں۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ میاں سر فضل حسین پنجاب کے آئندہ دستور میں کانگریس کے ساتھ اتحاد و اتفاق پر آمادہ ہیں اور معاشی اعتبار سے ایک غیر معمولی پروگرام انکے زیر تجویز ہے۔

ان تمام تجاویز، گفتگوؤں اور مشوروں کا مطلب غالباً یہ ہے کہ مسلمانوں کو جن صوبوں میں اکثریت حاصل ہے وہاں غیر مسلم جماعتوں کی ہمدردی اور اعانت حاصل کریں تاکہ صوبجاتی خود اختیاری اور جدید دستور پر کامیابی کے ساتھ عمل ہو سکے ہمیں اپنے سیاسی رہنماؤں کی اس خواہش پر کوئی اعتراض نہیں اس

لئے کہ جو لوگ آئندہ دستور کی حمایت کر رہے ہیں وہ اگر چاہیں تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی ملت کی بہت سی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ یہ بات اب ظاہر ہے کہ کانگریس کی مختلف جماعتیں "کامل آزادی" اور "عدم تعاون" کے اعلان اور جدید دستور سیاسی کو "رجعت آمیز" اور "ناقابل قبول" ٹھہرانے کے باوجود اس امر سے احتراز نہیں کریں گی کہ اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں۔ مزید براں ہندوؤں اور سکھوں کے وہ سیاسی فریق جو کانگریس سے الگ ہیں مسلمانوں کے سیاسی استحکام اور اُن صوبوں میں جہاں انکی اکثریت ہے نفاذ اصلاحات کے مخالف ہیں۔ اندریں حالات انکا یہ فرض ہے کہ ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتیں نئے دستور کے متعلق جو طرز عمل اختیار کرتی ہیں اس کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے اپنی حفاظت اور ترقی کا خیال رکھیں۔ اگر ہمارے بعض سیاسی رہنما دیانتداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ مجوزہ آئین میں ان کا حکومت سے اشتراک و تعاون یا دوسری ملتوں سے متحد ہو جانا ضروری ہے تو جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں اسلئے کہ یہ مسئلہ اختلاف رائے کا ہے ہمیں اس پر جو اعتراض ہے وہ یہ کہ اکابر ملت کی یہ روش علمی اور اصولی دونوں حیثیتوں سے ناقص ہے اور اس سے مسلمانوں کے لئے کوئی مفید اور مستقل نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ہمارے پاس جو دلائل ہیں ان کو ہم ابھی عرض کرتے ہیں۔

## محض اعلانات

جمہور اسلام کو مسلم لیگ، مسلم کانفرنس اور اکثر رہنماؤں کے متعلق سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مسلسل اعلانات اور وعدوں کے باوجود انکے اندر زندگی کی کوئی حرکت پیدا نہیں کی۔ مسلم کانفرنس کے موجودہ طرز عمل ہی کو لے لیجئے۔ اس کا اجلاس کسقدر ہنگامہ خیز تھا اور سر آغا خاں نے سیاسی، اجتماعی اور معاشی تعمیر نو کا جو پیغام مسلمانوں کو دیا کس قدر ضروری اور برمحل۔ لیکن یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ کانفرنس کی مجلس عاملہ نے اس کے لئے کیا لائحہ عمل مرتب کیا وہ بلا امتیاز مذہب غریبوں اور مفلسوں کی اصلاح کی طرف کب اور کیونکر متوجہ ہوگی۔ اگر السیوشی ایٹڈ پریس کی یہ اطلاع ٹھیک ہے کہ مسلم سیاسین کو ایک پروگرام یہ معاشی خطوط، پر وضع کرنا چاہئے یا یہ کہ بحیثیت ایک ملت کے انھیں اپنے داخلی استحکام میں سیاسیات کو مذہب سے الگ رکھنا ہے تو ہمیں معلوم ہو جانا چاہئے کہ اب لیگ یا کانفرنس کو کن "معاشی خطوط" کا اتباع مقصود ہے اور وہ کون سے مذہبی جذبات ہیں

جن کو آئندہ ہمارے سیاسی استحکام سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کا اختلاف و انتشار اور ان میں کسی موثر قیادت کا موجود نہ ہونا ہندوستان میں ضرب المثل ہے۔ ان کی کوئی جماعت اور کوئی فریق نہ جمہور کا ترجمان ہے نہ جمہور اس میں حصہ لے سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود لیگ اور کانگرس کا الگ الگ وجود قائم رہے گا کیونکہ یہ مجالس اکابر ملت کے مشورے اور اجتماع کی ہیں۔ بہت بہتر۔ مگر عامۃ الناس کی اصلاح اور وہ بھی بلا تفریق قوم و ملت — اور ایک معاشی لائحہ عمل کی کامیابی کے لئے جس میں غریب مسلمانوں سے بھی اتحاد و اشتراک مدنظر رہے گا جمہور کی رائے اور جمہور کی ہمدردیاں کس طرح حاصل کی جائیں گی؟ "سیاسیات پنجاب" کے مصنف نے ہمیں بتلایا ہے کہ اس خطے کے تمام مناقشات سیاسی ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انکی یہ تشخیص صحیح ہے لیکن کیا ان کا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنی سیاست میں مذہب کو فراموش کر دیں۔ ان کے خیالات سے تو کم از کم یہی شبہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور مسئلہ ہے جس پر ہمارے سیاسی رہنماؤں کو از سر نو غور کر لینا چاہئے اور وہ یہ کہ ہم اپنے آپ کو ایک اقلیت کیوں تصور کرتے ہیں۔ اگر اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا مذہب ایک مخصوص تہذیب و تمدن اور نظام جماعت کا مقتضی ہے تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان حضرات نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ اس مخصوص تہذیب و تمدن اور جماعتی نظام کے عملی امکانات پر غور کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس کی تشکیل اور قیام کا راستہ بتلائیں۔ ہم لوگ یہ معلوم کرنے کے متمنی ہیں کہ اسلام نے اپنی ہیئت اجتماعیہ اور اوامر و نواہی کا جو تصور قائم کیا ہے وہ ہماری سیاست و معیشت اور باہمی روابط میں کہاں تک سرگرم کار ہے اور ہم مسلمانوں کو اصولاً اور ذہناً اسکے متعلق کیا مطمح نظر اختیار کرنا چاہئے اسکی کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک فریق کامل آزادی کو اسلام کے لئے ضروری سمجھتا ہے اور دوسرا محض درجہ نوآبادیات کو کیا یہ صحیح نہیں کہ اصولی اعتبار سے مسلمانوں کا سیاسی اور معاشی نصب العین ایک ہے اور اگر ہمیں ایک جدید نظام کی تعمیر اور جمہور کی اصلاح و دستگیری مقصود ہے تو اس کے لئے مختلف "معاشی خطوط" کی بجائے ایک ہی "معاشی خط" پر چلنا پڑے گا۔ دردمندان قوم کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ہمیشہ الفاظ میں اُلجھائے رکھیں۔ ابھی کل کی بات ہے جب مسلم کانفرنس نے اس امر کا اعلان کیا تھا کہ وطن کیا ہے؟ ایک تودۂ خاک لیکن اب اس تودۂ خاک نے دفعتہً مادر وطن کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ کل تک مسلمانوں کو اپنی سیاست اور

معیشت میں دوسری قوموں سے الگ رہنے کی ضرورت تھی۔ ان کا فرض تھا کہ جداگانہ انتخاب پر اصرار کریں۔ مگر آج یہی مسلمان مشترکہ نیابت پر رضامند نظر آتے ہیں اور بغیر کسی تنظیم یا مادی اور سیاسی کی بنیاد کے صرف اپنی ہی نہیں بلکہ اپنے تمام اہل ملک کی جماعتی اصلاح اور معاشی تعمیر نو کا بیڑا اُٹھائیں گے۔

پھر یہ اعلانات ٹھیک اس موقعہ پر کئے جاتے ہیں جب نئے دستور کا نفاذ قریب ہے اور اس کے لئے ایک پرامن اور مصالحانہ فضا کی ضرورت ہے۔ مانا کہ ہندوستان کی ترقی اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے کی امداد و اعانت میں مضمر ہے اور بہی خواہاں ملت کا فرض ہے کہ اقلیت اور اکثریت میں صلح و آشتی کے جذبات پیدا کریں۔ لیکن اس امر کی ضرورت تو پچھلے دس برس میں ہر وقت محسوس ہو رہی تھی۔ اب دفعتہً یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ طریق انتخاب کے مسئلہ پر بھی غور کیا جا سکتا ہے حالانکہ نہ کانگریس میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی نہ اکثریت میں۔ کیا جداگانہ نیابت کے لئے جو مہم لڑی گئی تھی اس سے فائدہ اُٹھانے کا یہ وقت نہیں جب اصلاحات کا نفاذ قریب ہے؟ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس طرح کونسل اور اسمبلی میں سیاسی فرقہ بندی اور وزارتوں کی ترتیب ممکن ہے اور یہ بات فی نفسہٖ معیوب بھی نہیں لیکن سوال یہ ہے۔ کہ ان باتوں کے لئے ایک علیحدہ اور جداگانہ سیاست کی کیوں ضرورت ہے؟ کانگریس نے مسلمانوں کو مذہب، کلچر، اٹانومی، کا یقین دلایا ہے اور یوں بھی مسلمان نہایت جسارت کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اپنے اہل ملک کی سیاسی اور معاشی جدوجہد میں شریک ہو سکتے ہیں۔ مگر ہم سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا دین اور انکے مخصوص ادارات ایک ہیئت اجتماعیہ کے مقتضی ہیں جس میں ہندوستان کی سیاسی ترقی کے جملہ مراحل اتحاد و رواداری، کمزوروں، اور پست ماندوں کی اصلاح، معاشی مساوات اور خود مسلمانوں کی اخلاقی، ذہنی، مادی اور روحانی تعمیر کے سب عناصر موجود ہیں ہمارا خیال تھا کہ اس ہیئت ملیہ اور اس نظام سیاست کے ہوتے ہوئے مسلمانان ہند ایک عظیم الشان اجتماعی وجود کی شکل اختیار کر لینگے جس کے ایک جز کی ترقی اس کے کل اجزا کی ترقی کے مرادف ہوگی۔

مقام افسوس ہے کہ مسلمان اپنی ہیئت ملیہ کی از سر نو تعمیر کی بجائے ان رجحانات کا شکار ہو رہے ہیں۔ جن کا نتیجہ سیاسی اور معاشی دونوں صورتوں میں افتراق و انتشار کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا لیکن چونکہ یہ مسئلہ بجائے خود ایک جداگانہ بحث کا محتاج ہے اس لئے اس کا تذکرہ ہم کسی آئندہ اشاعت میں کرینگے۔ انشاء اللہ

# حرفِ شکایت

از رشحاتِ قلم آقائے مرتضیٰ احمد خاں میکش مدیر روزنامہ احسان لاہور

خلافِ شیوۂ مستی ندیدۂ از من
چرا بعذر گناہم رمیدۂ از من

ہمائے بخت من آستی و دل نشیمن تست
عجب کہ دام ندیدہ پریدۂ از من

جفا نمودی ولیکن دریں زمان دراز
کدام حرفِ شکایت شنیدۂ از من

بہ آں نگاہِ تلطف کہ برد صبر و قرار
متاعِ جانِ گرامی خریدۂ از من

کرم نما و منہ در قفس مرا پر و بال
کہ از گمان پریدن بریدۂ از من

بجانِ من کہ بجاں محرمی ولے ہیہات
نقابِ چہرۂ خود در کشیدۂ از من

خراب آرزوئے نوشِ آں لبِ شوخم
کہ بار بار بدنداں گزیدۂ از من

ترا بہ نازِ تو از آمدن دریغ مدار
مگر بہ سہو گمانے دریدۂ از من

---

# زبان کا اثر مذہب پر

محمد اسد خاں بی۔ اے

زبان اظہار خیالات کا ایک ذریعہ ہے۔ زبان اور خیالات میں ظرف اور مظروف کی نسبت ہے لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ع نشہ کو تعلق نہیں پیمانے سے۔ اسی طرح خیالات بھی کسی ایک زبان کی قید سے آزاد ہیں۔ واقعی علوم۔ فلسفے اور مذاہب مختلف زبانوں میں بے تکلف منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک عام علوم و فنون کا تعلق ہے اس اصول میں کوئی استثنا نہیں۔ البتہ مذہبیات کے معاملے میں یہ مسئلہ قدرے غور طلب ہے کیونکہ بعض اوقات وہ صورت ہوتی ہے کہ ع آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے۔ علوم اور فلسفوں کا تعلق محض خیالات سے ہوتا ہے لیکن مذہب میں مخصوص روایات۔ تاریخی اثرات اور نفسیاتی کیفیات مل کر کچھ ایسی صورت پیدا کر دیتی ہیں کہ بعض حالتوں میں مذہبی خیالات ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو کر اپنی حقیقی نوعیت کھو بیٹھتے ہیں۔ جو مذاہب محض فلسفیانہ خیالات پر مبنی ہیں اور عملی زندگی سے کم تعلق رکھتے ہیں وہ شاید کسی حد تک اختلاف زبان سے متاثر نہ ہوں لیکن کم از کم اسلام کے صحیح مفہوم ادا کرنے میں بعض زبانیں اپنی فطری کمزوری یا غیر اسلامی تمدن کے گہرے اثر کے باعث نہایت غیر موزوں ثابت ہوتی ہیں۔ کلام پاک میں "اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ" میں "عربیا" کی تخصیص غالباً اسی نکتہ کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ اسلام میں مختلف زبانوں میں منتقل ہونے کی قابلیت نہیں یا اسلام زبانوں کا امتیاز برقرار رکھتا ہے۔ جس طرح یہ دین فطرت رنگ و نسل کی تفریق سے بالاتر ہے۔ اسی طرح اختلاف السنہ سے بھی بلند تر واقع ہوا ہے۔ البتہ خود بعض زبانیں ایسی ہیں جن میں مخصوص اسلامی خیالات کے ادا کرنے کی پوری صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ اگر ریشمی کپڑے میں شعلہ کو لپیٹنے کی کوشش ناکام رہے تو تصور اس کپڑے کا ہے نہ کہ شعلہ کا۔ کیونکہ شعلہ کو ایک ایسا ہی فانوس محصور کر سکتا ہے جو اس کی حرارت کی تاب لا سکے۔

کسی زمانے میں ہمارے مذہبی علما فتویٰ دیا کرتے تھے کہ انگریزی زبان پڑھنا کفر ہے۔ انکی یہ تنگ نظری سنجیدہ علمی حلقوں میں محض ایک ہنسی خیز تبسم کی مستحق سمجھی جاتی ہے لیکن جہاں تک نتائج کا تعلق ہے انگریزی

زبان میں تعلیم پائے ہوئے لوگوں کی حالت کو دیکھکر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زبان کا اثر مذہبی خیالات پر کس قدر نمایاں طور پر پڑتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان میں عربی اور فارسی کے اثر سے اسلامی تمدن اور اسلامی خیالات کی ایک رَو دوڑ گئی تھی۔ ان اسلامی اثرات کے نمونے ابتک بھی ہندوستان کی مختلف قوموں کے طرز تمدن اور مختلف اصلاحی اور مذہبی تحریکوں کی صورت میں موجود ہیں لیکن اس وقت جب انگریزی زبان نے فروغ پایا ہے تو ہر طرف الحاد و لامذہبی کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ کیا انگریزی زبان میں اسلامی تعلیمات موجود نہیں؟ کیا قرآن مجید اور ہزارہا اسلامی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ نہیں ہو چکا؟ کیا بہت سے اکابر اسلام نے خود انگریزی زبان میں مذہبی کتابیں تصنیف نہیں کیں؟ جب ایسی صورت ہے تو کیا وجہ ہے کہ اسلامی تعلیم مغرب کی مادی تہذیب کے اثرات پر غالب نہیں آسکی انگریزوں کو متاثر کرنا تو درکنار خود انگریزی خواں مسلمانوں میں اپنے مذہب سے بیگانگی اور بیزاری پائی جاتی ہے۔

اس سلسلے میں میں نے جہاں تک غور کیا ہے یہی پایا ہے کہ اہل مغرب کی صدیوں کی مخالفتِ اسلام انکی عیسائیت میں قدیم کافرانہ عقائد کی آمیزش مذہب کے غلط تصور اور پھر موجودہ مادی تہذیب نے مغربی زبانوں کو اس قابل ہی نہیں رکھا کہ وہ اسلام کے حقیقی تخیل کو کماحقہٗ ادا کر سکے۔ انگریزی زبان اس وقت دنیا کی سب سے بڑی زبانوں میں سے ہے اور وسعت و عالمگیری کے لحاظ سے شاید ہی کوئی زبان اس کا مقابلہ کر سکے لیکن مخصوص اسلامی خیالات کے اظہار میں نہ صرف افسوسناک طور پر خام و نامکمل ثابت ہوتی ہے بلکہ اکثر اوقات سخت غلط فہمیاں پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ مثال کے طور پر صرف چند نمونے ملاحظہ ہوں جن سے اس زبان کی خامی اور غیر موزونیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

**اذان** - اسلامی دنیا میں اس لفظ نے جو خاص مفہوم حاصل کر لیا ہے اُسے سب مسلمان اور مسلمانوں سے تعلق رکھنے والی قومیں اچھی طرح جانتی ہیں۔ لیکن چونکہ کسی اور مذہب میں لوگوں کو عبادت کی طرف بلانیکا ایسا طریقہ موجود نہیں اس لئے کسی کے ہاں لفظ "اذان" کے مفہوم ادا کرنے والا لفظ بھی نہیں ملتا۔ انگریزی میں اسے کال ٹو پریئر Call to Prayer (عبادت کی طرف بلاوا) کہکر گذارہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے انگریزوں کو اذان کا کیا تصور ہوتا ہوگا؟ ایک انگریزی فلم میں ایک مسلمان کو اس طرح اذان دیتا دکھایا گیا کہ وہ بلندی پر کھڑا ہو کر بازو پھیلا کر ہاتھوں کے اشارے اور سر کی جنبش سے لوگوں کو مسجد کی طرف بلاتا ہے۔

**مؤذن** - اذان کی طرح موذن کے لئے بھی انگریزی میں کوئی موزوں لفظ موجود نہیں اور اس کا ترجمہ بالعموم کرائیر Crier (چلانے والا) کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ اس لفظ سے موذن کی حیثیت نگاہوں سے کس قدر گر جاتی ہے۔

**الہام** - اس لفظ کے لئے انگریزی میں انسپریشن Inspiration کا لفظ رائج ہے لیکن اس کا استعمال اس قدر حامیانہ ہے کہ اس کے ذریعے الہام کا حقیقی مفہوم ادا نہیں ہوتا کسی خیال آجانے یا کسی بات سوجھ جانیکو بھی انسپائر سے تعبیر کیا جاتا ہے اگر کسی شخص نے کوئی دلچسپ بات کہدی اور اس کی اصلیت دریافت کی گئی تو وہ بول اٹھے گا کہ میں اس بات میں فلاں واقعہ سے انسپائر ہوا۔ یعنی میں نے فلاں واقعہ سے متاثر ہوکر یہ بات کہی۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک انگریزی داں کو لفظ انسپائر کے ذریعے الہام کے بلند مفہوم کا کیونکر تصور دلایا جاسکتا ہے۔

**وحی** - جس طرح مدارج کے لحاظ سے الہام اور وحی میں فرق ہے اسیطرح انگریزی زبان میں انسپریشن Inspiration اور ریویلیشن Reveal ation کے الفاظ اختلاف مراتب کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں سے انسپریشن کے مفہوم کا ذکر تو اوپر آچکا ہے البتہ ریویلیشن کے لفظ میں کافی وسعت ممکن ہے لیکن افسوس ہے کہ مغرب کے عیسائیوں نے اناجیل اربعہ اور رسولوں کے اعمال، کو اسی لفظ کے تحت میں لاکر اس کے مفہوم کو بہت محدود کر دیا ہے۔

**ہجرت** - اسلام میں ہجرت کا لفظ سنتے ہی انتہائی ایثار قربانی کا مقدس واقعہ ذہن میں آجاتا ہے جس سے پیغمبر صلعم اور آپ کے رفقاء کی عظمت کا نقش دل پر بیٹھ جاتا ہے لیکن انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ فلائیٹ Flight کیا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں فرار یا بھاگ جانا۔ اس ترجمہ سے سامع کے دل پر جو حقارت آمیز اثر ہوتا ہے وہ صاف ظاہر ہے لیکن اس کے باوجود انگریزی زبان میں مسلمان مصنفین بھی یہی لفظ استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

**نبی** - نبی کے لئے انگریزی میں پرافٹ Prophet کا لفظ مستعمل ہے جس کا عام مفہوم محض ایک پیشینگوئی کرنے والے کا ہے۔ اسکی اصل کاہنوں اور بطریقوں کے تصور سے معلوم ہوتی ہے اور انگریزی کے موجودہ لٹریچر میں تو یہ نہایت ہی ادنیٰ مفہوم میں مستعمل ہیں۔ پیشینگوئی تو ایک طرف رہی اگر کوئی شخص آئندہ کے متعلق محض کسی خیال کا اظہار بھی کردے تو اس پر لفظ پرافٹ کا اطلاق ہوجاتا ہے

مسلمان آنحضرت صلعم کے لئے بالعموم ہولی پرافٹ یعنی مقدس پرافٹ کا امتیازی لقب استعمال کرلیا کرتے ہیں لیکن درحقیقت انگریزی زبان میں لفظ پرافٹ اس قدر حقیر اور مبتذل ہے کہ مقدس کا اضافہ بھی اس کے بُرے اثر کو زائل نہیں کرسکتا۔ اس لفظ کی تذلیل کا ایک سبب عیسائیوں کا الوہیت مسیح کا عقیدہ بھی ہے۔ اُن کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ انسان کے پردے میں خدا کی حیثیت رکھتے ہیں (نعوذ باللہ) اور انکے علاوہ باقی سب انبیا محض پرافٹ ہیں۔ مسیح کے اس خصوصی تصور سے جو ہندوؤں کے اوتار اور مجوسیوں کے حلول کے عقیدے سے ملتا جلتا ہے پرافٹ کا درجہ نگاہوں سے اور بھی گر جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام میں جہاں اوتار کا عقیدہ ناپید ہے انبیاء کرام انسانوں میں بلند ترین درجے کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا یہ مرتبہ انگریزی کے لفظ پرافٹ سے کسی طرح بھی ظاہر نہیں ہوسکتا۔

یہ چند لفظ بطور مُشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ صوم۔ صلوٰۃ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ بیعت۔ ثواب۔ برکت طواف۔ کلمہ۔ حدیث وغیرہ بے شمار ایسے الفاظ ہیں جو عالم اسلام میں خاص مفہوم اختیار کرچکے ہیں۔ اور انگریزی زبان میں ان کا ترجمہ نہ صرف اُس مفہوم کو کماحقہٗ ادا کرنے سے قاصر ہوتا ہے بلکہ اکثر حالتوں میں اُن کی اصلیت ہی کو بگاڑ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے انگریزی تراجم اکثر پھیکے اور بے کیف ہوتے ہیں اور انگریزوں پر تو کیا خود انگریزی داں مسلمانوں پر بھی اثر انداز نہیں ہوسکتے۔ (اس وقت تک کلام پاک کے جس قدر تراجم پیش کئے گئے ہیں اُن میں سے علامہ عبداللہ یوسف علی کا آزاد ترجمہ مقابلتاً بہترین معلوم ہوتا ہے اور اس کی خوبی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ انھوں نے لفظی ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کلام پاک کی روح کو اپنے الفاظ میں اہل زبان کے ذوق کے مطابق منتقل کرنے کی کوشش کی ہے) چنانچہ جو مسلم اور غیر مسلم انگریزی زبان کے ذریعے اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ اسلام کی حقیقی شان کا اندازہ نہیں کرسکتے اور انگریزی زبان کی خامی محسوس کرنے کے بجائے خود مذہب اسلام کی بابت غلط فہمی میں پڑجاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مذہب سے بیگانگی کے متعدد اسباب میں سے ایک سبب یہی زبان کی غیر مونونیت ہے۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر انگریزی زبان میں یہ صلاحیت موجود نہیں تو کیا صرف عربی زبان اس قابل ہے کہ اسلام کی اصلی شان کو قائم رکھ سکے یا کسی اور زبان میں بھی یہ طاقت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خود عربی زبان بھی تو اسلام سے پہلے یہ صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ محض اسلامی تاریخ، تہذیب اور تمدن

ہی کا نتیجہ ہے کہ اس زبان میں اسلام کی صحیح تعبیر کی قوت پیدا ہو گئی ہے اور یہی حالت کم و بیش اُن زبانوں کی ہے جہاں اسلام تہذیب و تمدن کے ذریعے سرایت کر گیا۔ مثلاً فارسی کو دیکھئے۔ ایران میں اسلام کا اس قدر اثر ہوا ہے کہ یہ ملک ہی سرے سے اسلامی ملک بن گیا اور اس کی زبان بھی گویا مسلمان ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ خدا، پیغمبر، نماز، روزہ وغیرہ جیسے بہتیرے الفاظ نے بعینہٖ وہی حیثیت اختیار کر لی ہے جو کہ عربی کے مترادف الفاظ کی ہے اس سے یہ معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ اسلام صرف عربی یا کسی اور ایک زبان میں محدود نہیں بلکہ یہ مختلف زبانوں میں ایسی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے کہ وہ اسلامی تخیل کی بقدر بساط صحیح نمائندگی کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن ملکوں میں اسلامی تمدن نے جس قدر گہرا اثر کیا ہے اُسی قدر وہاں کی زبانوں میں اپنی صحیح تعبیر کی صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ فارسی کی طرح ترکی۔ تاتاری پشتو۔ بلوچی۔ بربری وغیرہ زبانیں اس کی مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عربی زبان کے بہت سے اسلامی الفاظ ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایک طرح کی اصطلاحی حیثیت اختیار کر لی ہے لہٰذا ایسے الفاظ کو ہر زبان میں بجنسہٖ رکھنا پڑا ہے۔

آخر میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں نے جو اسلامی تعلیمات کے لئے انگریزی زبان کی غیر موزونیت دکھائی ہے اس سے یہ مقصود نہیں کہ مسلمانوں کے لئے انگریزی پڑھنا کفر ہے یا اس کو ترک کر دینا مسلمانوں کے حق میں مفید ہے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ اصلی غرض یہ ہے کہ جس طرح بہت سی غیر اسلامی زبانوں کو ہمارے بزرگوں نے اسلامی بنا لیا تھا اسی طرح ہمیں بھی چاہئے کہ انگریزی زبان کو جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی زبانوں میں سے ہے اسلامی تعلیمات کے حامل ہونے کے قابل بنانے کی کوشش کریں۔

اس مقصد کے حصول کے لئے صرف دو صورتیں ہیں۔ سب سے پہلی تو یہ کہ مغرب میں پروپاگنڈا وغیرہ سے نہیں بلکہ عملی نمونے پیش کر کے اسلام کی تبلیغ کی جائے یہاں تک کہ اسلامی تہذیب مغربی تمدن پر چھا جائے۔ اس صورت میں انگریزی ہو یا کوئی اور مغربی زبان وہ خود بخود صحیح اسلامی نقطۂ خیال کے ظاہر کرنے کے قابل ہو جائیگی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب تک اپنے تمدن کے اثر سے کسی غیر زبان کو مسلمان نہیں کیا جا سکتا اس وقت تک کوشش یہ کرنی چاہئے کہ ایسے اسلامی الفاظ جو اسلامی تاریخ سے وابستگی کے باعث یا اسلام کے خاص طرز تخیل کے سبب کسی مخصوص مفہوم کو ادا کرنے میں ایک طرح کی اصطلاحی حیثیت اختیار کر چکے ہوں اُن زبانوں میں بجنسہٖ استعمال کئے جائیں اور اُن کا ترجمہ کر کے اسلام

کے متعلق غلط تصورات پیدا کرنے کا موقع نہ بہم پہنچایا جائے۔

بعض اسلامی الفاظ ایسے ہیں جنکو غیر زبانیں ضرورتاً جذب کرنے پر مجبور ہیں۔ مثلاً مکہ معظمہ میں سالانہ بین الاقوامی اجتماع اور دنیا بھر کے مسلمانوں کا روزانہ اُس کی طرف منہ کرکے عبادت کرنا ایسے واقعات ہیں جن کی نظیر اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اس لئے جب کبھی کسی اور شہر کی مرکزی حیثیت یا غیر معمولی کشش کا تصور دلانا ہو تو انگریزی زبان والے لامحالہ اس مفہوم کو مکہ کے لفظ سے ادا کرتے ہیں یعنی فلاں مقام کھلاڑیوں کا مکہ ہے یا فلاں شہر ارباب سیاست کا مکہ ہے وغیرہ۔ یہ اور اسی قبیل کے بہت سے لفظ انگریزی زبان میں اسلام کی خدمت کے لئے نہیں بلکہ ضرورتاً اپنی حاجت روائی کے لئے شامل کر لئے گئے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ خود اسلام کی حقیقی خدمت کے لئے اور اسلامیات کے صحیح مفہوم ادا کرنے کی غرض سے مخصوص اسلامی الفاظ اس زبان میں رائج کئے جائیں۔ یہ کام انگریز نہیں کرینگے بلکہ خود مسلمانوں کے کرنے کا ہے۔ مسلمان مصنفین کو چاہئے کہ جب کبھی انگریزی میں کچھ لکھیں تو عام ترجمہ کرکے اسلامی خیالات کی تحقیر و تذلیل کا باعث نہ بنیں بلکہ ہمیشہ اصلی الفاظ استعمال کرکے انہیں رواج دینے کی کوشش کریں۔ ورنہ بحالت موجودہ انگریزی زبان اسلام پر مضر اثرات ڈالتی اور دنیا کے ایک بڑے حصے میں اسلام کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرتی رہے گی۔

---

# پست ماندگان ہند میں تبلیغ اسلام

## پنجاہ سالہ، تبلیغی پلان

راغب احسن ایم۔اے۔ کلکتہ

میں «طلوع اسلام» کا بیحد ممنون نوازش ہوں کہ اس نے نہ صرف میرے پنجاہ سالہ تبلیغی پلان کے خلاصہ کو شائع کیا بلکہ پست ماندگان ہند میں تبلیغ اسلام کے موضوع کو اپنا ایک مستقل مبحث کو قرار دیا ہے طلوع اسلام جس خالص نصب العین کی صبح امید ہے، اس کے لئے ایسا کرنا نہایت ضروری تھا۔

اچھوتوں، یا وسیع تر الفاظ میں، پست ماندوں، کی اصلاح کو اب تک کانگرس اور مسلم لیگ بالاتفاق صرف ہندو سماج کی اصلاح کا کام سمجھتی آرہی ہیں۔ کانگریس نے اس کو اپنے پروگرام میں نمایاں جگہ دی ہے گاندھی جی نے اس کو اپنی زندگی کا عزیز ترین مقصد قرار دیا ہے لیکن کانگریسی ہریجن تحریک کا مقصود پست ماندوں کو صرف ہندو جاتی اور ہندو سماج کے لئے محفوظ کرنا ہے۔ ایک عرصہ تک بہت سے مسلمان، اچھوتوں کی اصلاح بذریعہ اسلام، کی تحریک کو منافی نیشنل ازم سمجھتے رہے ہیں۔ اور آج بھی کئی کانگریسی مسلمان ہیں جو اونچ جاتی کے ہندو نیتاؤں کے ڈر یا لیڈری اور ہر دلعزیزی کے کھو جانے کے خوف باطل کے باعث اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کا نام نہیں لے سکتے۔

ڈاکٹر بی آر۔ امبیدکر صاحب، لیڈر پست ماندگانِ ہند کے زیر اثر جب سے یہ ریزولیوشن مختلف اچھوت کانفرنسوں نے پاس کیا ہے کہ ہندو دھرم کی بنیاد ہی عدم مساوات پر ہے اور اس کو دھرم کہنا موزوں نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک متعدی سوشیل بیماری ہے۔ اور شودروں کی آزادی صرف ایک مذہب مساوات کے دائرہ اخوت میں داخل ہونے پر منحصر ہے، مسلمانوں میں ایک حرکت پیدا ہوئی ہے۔ میں نے عام مسلمانوں کی تبلیغی دلچسپی کو پیش نظر رکھکر دو آزمودہ صورتیں تبلیغ اسلام کی مسلم پریس میں پیش کی ہیں پہلی صورت انفرادی تبلیغ کی ہے۔ اور یہ منحصر ہے صاحبان دل کی ذاتی ہمت، قربانی اور شخصیت کی فتوحات روحانی پر دوسری صورت اجتماعی تبلیغ کی ہے اور یہ منحصر ہے صاحبان دماغ: صاحبان دل اور صاحبان زر، کی اجتماعی تنظیم

کی صلاحیت اور طاقت پر۔ میرے خیال میں ہر بچن مسئلہ کی وسعت، نوعیت اور پیچیدگی اس کی مقتضی ہے کہ اس پر چہار طرف سے حملہ کیا جائے اور ہر صورت سے کوشش کی جائے۔

**انفرادی تبلیغ** - انفرادی تبلیغ" کی صورت یہ ہے کہ کوئی صاحب دل مسلمان اچھوتوں کی سی آبادی میں جم کر بیٹھ جائے۔ اُن کے ساتھ عملی ہمدردی دکھائے۔ اُن کی جسمانی اور باطنی صفائی کرے۔ اور بطریق خدمت و محبت ان کو دائرہ اخوت میں لائے۔ انفرادی تبلیغ کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مدینہ منورہ کے انصار و مہاجرین کے تاریخی **عقد مواخات** کے اصول پر ایک ایک مسلم خاندان، ایک ایک اچھوت خاندان کو اپنا بھائی بنالے۔ اور پھر ساری زندگی اس بھائی چارہ کو نبھانے اور نبھانے کا مذہبی حلف جماعت مسلمین کے سامنے، علاقہ کی مسجد میں اٹھائے اور اپنے نو مسلم بھائی کی تعلیم و تہذیب اور فلاح و بہبود کا ویسا ہی خیال کرے جیسا کہ اپنے حقیقی بھائی کی کرتا ہے جیسا کہ عرض کیا گیا، انفرادی تبلیغ" کی کامیابی سراسر خاص اشخاص کی شخصی قوت اور انفرادی سیرت پر منحصر ہے صوفیائے کرام نے ہندوستان میں اسی طریقہ محبت سے لاکھوں کو فیضان اسلام سے مستفیض کیا تھا۔ اگر آج بھی ہماری خانقاہیں اور گدیاں چاہیں تو اس میدان تبلیغ میں بہت کچھ کامیابی حاصل کر سکتی ہیں۔

**اجتماعی تبلیغ** - اجتماعی تبلیغ سے مراد، اشاعت مذہب بطریق انجمن سازی ہے۔ ہر کام کی طرح اسکی کامیابی کا دارومدار بھی بہت کچھ، کام کرنے والوں کی صلاحیت اور للّٰہیت پر ہے لیکن بعض اوقات خلوص اور استعداد تنہا ناکافی ہوتا ہے اور طریقہ کار کی صحت اور تنظیم کی عمدگی بھی ضروری ہوتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہر بچن مسئلہ ایک ایسا ہی خارزار مسئلہ ہے۔ یعنی اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کرنے، اور پست ماندوں کو حقیقی معنی میں درجۂ انسانیت پر لانے اور حلقۂ اسلامیت میں جذب کرنے کے لئے، بے پایاں ہمدردی خلوص اور للّٰہیت کے جذبۂ صادق کے ساتھ، بہت زیادہ روپے، قابلیت اور تنظیم کی ضرورت ہے۔

**پست ماندوں کی تاریخی اور عددی حالت** - ہر بچن مسئلہ کی نوعیت وسعت اور سخت جانی کا یہ حال ہے کہ یہ زمانۂ قبل از تاریخ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کے عہد سے بھی بہت پرانا ہے اس کو حل کرنے کیلئے بڑے بڑے مہاتماؤں اور رشیوں نے کوشش کی ہے لیکن سب ناکام ہوئے ہیں۔ آج بھی تمام پست ماندہ اقوام اور طبقات کی مجموعی تعداد کم سے کم دس کروڑ ہے۔ انکے اندر ہندو سماج کے اچھوت، شدر، پاریا، اور چنڈال کے علاوہ اصلی باشندگان ہند بھی شامل ہیں۔ کیونکہ وہ بھی دراصل آریا فاتحین ہند ہی کے مظلوم اور

پست ماندہ ،، ہیں۔ آریوں نے اصلی باشندوں کی ایک بڑی جماعت کو مفتوح بناکر اپنا غلام قرار دیا تھا۔ جو لوگ اُن کے ظلم سے بچکر، جنگلوں میں جا چھپے تھے وہی آجکل اصلی اصلی باشندے یا نیم وحشی کہلاتے ہیں اوران کے علاقے (Backward Areas) پست ماندہ کہلاتے ہیں۔ کیونکہ بدقسمتی سے ان کو سیاسی اصلاحات سے محروم ہی رکھا گیا ہے۔ ہندو ساہوکاروں اور زمینداروں اور راجوں نے اُن کو جنگلوں میں بھی آزادی سے رہنے نہیں دیا ہے۔ بہار، چھوٹا ناگپور، رانچی اڑیسہ اور سی۔پی۔ کے اصلی باشندے بُری طرح ہندو مہاجنوں اور ہندو زمینداروں کے پنجہ میں گرفتار ہیں۔ انکی بچی کچی جنگل کی زمینیں بھی اُنکے ہاتھ سے نکل گئی ہیں۔ قانون انتقال اراضی کا نفاذ، بہت دیر میں ہوا ہے۔ ان غریبوں تک آزادی اور تہذیب کی روشنی ابتک صرف مسیحی مشنوں کے ذریعہ پہونچی ہے۔ لیکن اس کے اندر بھی انکی دائمی سیاسی محکومیت کا خطرہ پوشیدہ ہے۔

**پست ماندوں کی معاشی اور مالی حالت** ۔ یہ تو پست ماندگانِ ہند کی وسعت تعداد اور تاریخ کا حال ہے۔ پست ماندگی کی نوعیت کی یہ کیفیت ہے کہ وہ قریباً ہر حصہ ملک میں ہندو سماج کے ذلیل ترین کارکن اور پیشہ ور ہیں۔ اُن کی روزانہ زندگی۔ بالکل اونچ جاتی کے ہندوؤں پر منحصر ہے۔ وہ کہیں کہاری کا کام کرتے ہیں کہیں ڈوم، چمار اور مہتر کی پوزیشن میں ہیں۔ اُن کی بڑی تعداد، یونانِ قدیم کے طبقہ تھیٹس (Thetes) کی طرح بے زمین کاشتکاروں یا مزدوروں کی ہے۔ یہ طبقہ ،، کمیا ،، کہلاتا ہے۔ اس کمیوتی سسٹم کو کیا طور پر، شاہی زراعتی کمیشن اور سنٹرل بینکنگ انکوائری کمیٹی نے غلامی کے مماثل قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کے ماتحت غریب پست ماندے اپنے مالکوں سے روپیہ قرض لیتے ہیں اور اُس کی ادائیگی کی یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ اپنے سرکار کی زمین اور گھر پر کام کیا کرینگے۔ ان غریبوں کو برائے نام کچھ ساگ ستو، کھانے کو مل جاتا ہے۔ اور چونکہ وہ اپنا قرض اور اس کا نامعلوم ولامحدود سود کبھی ادا نہیں کرسکتے ہیں۔ اس لئے مدۃ العمر، اپنے مالک کے پابند "کمیا" یا "نہارا"، قرار پاتے ہیں۔ انکی مثال اسپارٹا کے اُن "ہیلوٹ" کی سی ہے۔ جو اپنے اسپارٹن آقاؤں کے تمام جسمانی محنت اور دستی مشقت کے کام انجام دیتے تھے۔ ہندو اونچ جاتیاں بھی یونانیوں کی طرح، دستی محنت کو منافی شرافت اور مخالف شہریت تصور کرتی ہیں۔ ہر باہمن برہمن، راجپوت اور چھتری کے گھر میں کمیا اور کہار ہوتے ہیں۔ جو اس کی جسمانی خدمت اور گھر کی دستی اور ذلیل خدمات انجام دیتے ہیں۔ گویا اس دستی

محنت کے معاملے میں "یونانی ارسطو" اور "ہندو منو" کے خیالات متحد ہیں۔ الغرض پست ماندوں اور کمیتوں کی مالی حالت یہ ہے کہ وہ نسل در نسل ہندو مہاجنوں، ہندو زمینداروں اور ہندو اونچ جاتیوں کے تابعدار اور محکوم چلے آتے ہیں۔ اُنکی روزانہ معیشت بڑی حد تک ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ اُن کا لین دین ہندو سرمایہ داروں کے ہاتھ ہے۔ وہ اُن کے مقروض اور مرہون ہیں اور اُنکی معاشی آزادی بہت بڑی اجتماعی جدوجہد، بیحد کوشش و تحریک، روپیہ اور قانون سازی کی محتاج ہے۔ اور ظاہر ہے اتنا بڑا، پیچیدہ اور وسیع مسئلہ بغیر ایک عظیم الشان پلان یا تنظیم کے کبھی حل نہیں ہو سکتا

**پست ماندوں کی تہذیبی و نفسیاتی حالت**۔ اچھوتوں کی تہذیبی اور نفسیاتی حالت، اُنکی معاشی اور مالی حالت سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ مسلمانوں اور انگریزوں کی حکومت اور موجودہ انڈسٹریل ازم (صنعت گری) کی ترقیات نے انکی مادی حالت کو تو کسیقدر بہتر بنایا ہے۔ لیکن اُنکی باطنی اور کلچرل حالت میں بہت کم ترقی ہوئی ہے۔ مادیات کا تعلق "سی وی لائی زیشن" یا تمدن کے ظاہرات سے ہوتا ہے اور ان کا بدلنا نسبتاً بہت آسان ہے۔ لیکن "کلچر" (تہذیب) کا تعلق ایک جماعت کی نفسیات، روایات، عادات و رسوم راسخہ، عقاید السنہ، ادبیات اور فنون لطیفہ سے ہوتا ہے جن کی بنیادیں اُن کی قومی روح میں صدیوں میں پڑتی اور جمتی ہیں اور نسلوں میں اُس کے اندر کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس طرح ہر قوم اور جماعت، اپنی علیحدہ تہذیب رکھتی ہے جسے سوشیلاجی کی زبان میں گروپ کلچر کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پست ماندگانِ ہند کی جس طرح نسل واصل ایک نہیں ہے، اسی طرح اُن کا گروپ کلچر بھی ایک نہیں ہے۔ وہ بے شمار جاتیوں، توسموں، گروہوں اور نسلوں میں منقسم ہیں۔ اُنکی زبانیں مختلف ہیں۔ اُنکے مذہبی عقاید اور اوہام جداگانہ ہیں۔ بعض بالکل انیم ازم کو مانتے ہیں۔ بعض ہندو ازم اور انیم ازم کی سرحد پر ہیں۔ بعض اوجھا، گنی، بھوت، پریت، جڑیل اڑیل پر عقیدہ رکھتے ہیں اور بعض ڈریوڈین دیوی دیوتاؤں سے وابستہ ہیں۔ الغرض پست ماندوں کے لئے کئی گروپ ہیں اور اس لئے اُن کے کئی جداگانہ گروپ کلچر بھی ہیں۔

اصلی باشندگانِ ہند کو چھوڑ کر تمام ہندو یا نیم ہندو پست ماندوں کی نفسیات میں ایک مرض مزمن راسخ ہو گیا ہے۔ صدیوں کی تاریخی غلامی، روایتی محکومیت اور کرم و دھرم کے آواگونی عقیدہ نے ذلیل غلامانہ ذہنیت کو اُن کی فطرت ثانیہ بنا دیا ہے۔ وہ اپنی محکومیت کو قطعاً محکومیت

معلوم ومحسوس نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنی حالت کو اپنے ازلی قانون کرم کا پھل مانتے ہیں۔ اُن کے اندر تبدیلی کا احساس بالکل نہیں ہے۔ ان کے دل کی آگ کو سرد کر دیا گیا ہے۔ وہ جانوروں کی طرح اپنی حالت پر قانع ہیں منوشاستر کے مطابق غلامی، سیوا، اور محنت ومشقت میں زندگی کاٹنا عین اُن کے کرم کا پھل اور دھرم کا کرتب ہے تعلیم وتہذیب، خدا پرستی سے اُن کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ناپاک ہیں اور خدا کی کتاب کو نہیں چھو سکتے ہیں۔ خدا کے پاک مندر کے پاس نہیں بھٹک سکتے۔ اور دیو درشن نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اُنکے جسم کی طرح اُنکی نگاہ بھی ناپاک ہے اور پتھر کی مورتیاں ان کی نظر سے ناپاک ہو جاتی ہیں۔

ہریجن، ان تمام ذلتوں کو صدیوں سے خوشی کے ساتھ سہتا آرہا ہے۔ کیونکہ سرے سے وہ انکو ذلت ہی نہیں جانتا ہے۔ اُس کی نفسیات کی دنیا میں موجودہ دور اسلامیت اور دور جمہوریت کے باعث انقلاب کی ہوائیں چلنے لگی ہیں۔ حُریت، مساوات اور اخوت کی آوازیں اُس کے کان میں پڑنے لگی ہیں۔ بعض خوش قسمت اچھوتوں نے تعلیم حاصل کی ہے بعضوں نے اپنی معاشی حالت بہتر بنالی ہے۔ اور اب وہ سیاسی لحاظ سے جداگانہ نیابت کے مالک ہو چکے ہیں۔ ان تمام حالات نے مِل کر ایک انقلاب کا مسالہ تیار کیا ہے۔

**پچاس سال کیوں ضروری ہیں** ۔ تاہم تمام سنجیدگی کے ساتھ میرا یہ خیال ہے۔ کہ اگر میرے پنجاہ سالہ تبلیغی پلان کے مطابق، ایک ہزار لائف مبلغ، ایک کروڑ سرمایہ، اور بے شمار ناصرین کی تائید سے بھی اچھوتوں کو آزاد انسان اور مسلمان بنانے کی جدوجہد کریں تب بھی کم سے کم اُن کو اس مہم کی تکمیل میں پچاس سال صرف کرنا ہوگا اور کارکنوں کی کئی جماعتوں کو نسل در نسل یکے بعد دیگرے اس تحریک کو جاری رکھنا پڑے گا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ نفسیاتی جمود، قناعت پسندی، اور انقلاب وتبدیلی کا وہ خوف ہے جو غلامانہ ذہنیت سے اچھوتوں کے اندر جاگزیں ہو گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر امبیدکر بھی معہ اپنے تمام اعوان وانصار کے لاکھوں اچھوتوں کے ساتھ قبول اسلام کا فیصلہ کر دیں اور جماعتی تبدیلی مذہب کی ہوا عام ہو جائے۔ پھر بھی اچھوتوں کی قدامت پرستی، اوہام دوستی، غلامانہ ذہنیت اور معاشی تابعداری کا یہ حال ہے کہ پست ماندوں کی بہت بڑی تعداد بدستور ہندو سماج کے اندر باقی رہے گی اور اپنی غلامی کو ایک نئے سماج کی آزادی وتبدیلی پر ترجیح دیگی۔ غلامی کی انتہا یہ ہے کہ غلام اپنی غلامی سے محبت کرنے لگ جاتا ہے اور اپنے آزاد کرنے والے پیغمبران حُریت کو

اپنا دشمن جانتا ہے۔ اچھوتوں کی عام آبادی، ذہنی غلامی کی پست ترین پوزیشن میں ہے۔ اس عام آبادی تک آزادی اور اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے نہ صرف ڈاکٹر امبیدکر جیسے بے شمار اچھوت لیڈروں اور مبلغوں کی ضرورت ہوگی۔ بلکہ انکی بے شمار، روپے سے تائید کرنی بھی لازمی ہوگی۔ پھر بھی رسم ورواج اور رطابتی تعلقات کے سلاسل کو توڑنے اور آزاد ہونے کے لئے میرے اندازہ کے مطابق کم سے کم پچاس سال کی مسلسل محنت وتحریک ضرور ہوگی ہے۔

**پلان کیوں ضروری ہے؟** بعض حضرات نے پلان اور تنظیم کی مخالفت کی ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ یہ کام مردان مومن کا ہے۔ اگر ایک صاحب ایمان، جوش وخروش اور خلوص وللّٰہیت کے ساتھ تبلیغ اسلام کا کام شروع کردیں تو آناً فاناً اچھوت مسلمان ہوسکتے ہیں۔ صاحب ایمان مبلغین کی فتوحات روحانی سے مجھے کبھی انکار نہیں تھا اور نہ اس وقت ہے۔ میں نے انفرادی طریقہ تبلیغ کو سب سے زیادہ اہم خیال کرتے ہوئے نہ صرف اس تحریک کے اندر اول جگہ دی ہے بلکہ اس موضوع پر سب سے پہلا مضمون بعنوان مواخاتِ مدینہ کی یاد تازہ کرو۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں لکھا ہے۔ بلاشبہ یہ اسلام کا امتیازی، کامیاب اور آزمودہ طریقہ تبلیغ ہے۔

تاہم میرا خیال ہے کہ دس کروڑ پست ماندگان ہند کے انسان اور مسلمان بنانے کا کام، اتنا بڑا وسیع اور اہم ہے کہ بغیر کسی پلان نقشہ عمل، اور تنظیم کے کامیاب وبامراد ہونا قرین قیاس نہیں ہے۔ یہ پلان صرف دو طرح کا ہوسکتا ہے ایک سیاسی فتح اور فوجی انقلاب کا پلان جسکے ماتحت قرن اولیٰ میں ایران، عراق مصر، شام، وغیرہ کو دائرہ اخوت اسلام میں داخل کیا گیا۔ اور مفتوحین مسلمان ہوکر عرب فاتحین میں شامل اور عالمگیر انقلاب کے داعی بن گئے۔ دوسرا پلان روحانی فتح، تہذیبی تسخیر، تعلیمی ترقی، اور اقتصادی آزادی کی ہوسکتا ہے۔ بحالات موجودہ ہم دوسرا پلان اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ حضرت حکیم الملت علامہ اقبال مدظلہ العالی نے آج ہی کے لئے لکھا تھا کہ

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور ۔۔۔ ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

**سب سے بڑا مالی وسیاسی مسئلہ** ۔ اچھوتوں کا مسئلہ صرف مذہبی تبلیغ کا مسئلہ نہیں ہے جو کلمہ طیبہ پڑھا دینے سے حل ہوجائیگا جس طرح "کھل جا سم سم" کہنے سے علی بابا نے غار کے دروازہ کھولنے کا مسئلہ حل کردیا تھا۔

دس کروڑ پست ماندگان ہند کا مسئلہ دراصل ہندوستان کا سب سے بڑا اقتصادی مسئلہ ہے۔ یہ سرزمین ہند کا سب سے بڑا مالی مسئلہ ہے۔ یہ اقوام ہند کی غلامانہ ذہنیت کے مٹانے اور اُن کے دلوں کو غیر اللہ کے خیال باطل سے آزاد کرنے کا نفسیاتی مسئلہ ہے۔ یہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت تعمیر کرنے کا سوشیالاجیکل مسئلہ ہے۔ یہ ہندوستان کو ایک آزاد قومی ریاست بنانے کا پولیٹکل مسئلہ ہے

**سب سے سستا سودا** - اگر، اتنے عظیم الشان نصب العین کے حاصل کرنے کے لئے پچاس سال کا قلیل ترین وقت صرف ہو، اور ایک کروڑ روپیہ اور ایک ہزار مجاہدین درکار ہوں۔ تو کون ہے جو اس کو دنیا کی سب سے نفع بخش تجارت اور اس زمانہ کا سب سے معجز نما انقلاب قرار نہیں دیگا؟ یہ کوئی سودا ہے تو بلا شک سب سے بہتر سودا ہے۔

**آزادی ہند کی کنجی** - میرا یقین ہے کہ اگر مسلمانوں کے ایمان، للہیت اور سیاسی بصیرت نے ساتھ دیا۔ اور انھوں نے پنجاہ سالہ پلان کے مطابق خالصاً لوجہ اللہ تحریک تبلیغ جاری کردی، تو نہ صرف اچھوتوں کی غالب اکثریت مسلمان ہو جائیگی، اور اُنکی معاشرتی حالت بہتر جائیگی بلکہ ہندوستان ایک متحدہ نیشن بنجائیگا۔ اور اتحاد ہند، اور آزادیٔ ہند کی کنجی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگی۔

اگر یہ معاملہ صرف مذہبی تبلیغ کا ہوتا تو چنداں روپے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور پلاننگ اور تنظیم بھی اہم نہیں ہوتی لیکن جب یہ مسئلہ مذہبی ہونیکے علاوہ، اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی بھی ہے تو روپے کی ضرورت روشن ہو جاتی ہے ہمیں صرف فرداً فرداً ایک ایک آدمی کو مسلمان بنانا نہیں ہے۔ بلکہ جماعت در جماعت، فوج در فوج، اور جوق در جوق، لوگوں کو دائرہ اسلام میں لانا، اور اُنکی زندگانی کو بہتر بنانا ہے اور ہندو مہاجنوں کے جال سے چھڑانا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے ہماری تحریک کی کامیابی پر ہندوؤں کی مخالفت انتہائی نقطہ تک پہنچ جائے گی اور جو اچھوت مسلمان ہونگے۔ بہت سے علاقوں میں ہندو اُن کا حقہ پانی کاٹ کرینگے۔ بلکہ اُن پر بے شمار مظالم کرینگے۔ اگر ہم واقعی اچھوتوں کو من حیث القوم مسلمان کرنا چاہتے ہیں تو لازم اور ضروری ہے کہ ہم اُنکی مالی تائید کے لئے تیار ہو جائیں۔ نو مسلمین کی تالیف قلوب کو قرآن شریف نے ایسے ہی حالات کے لئے مصارف زکوٰۃ میں شمار کیا ہے۔

**تقسیم کار** - پلان اسی لئے ضروری ہے کہ ہم کام اور کام کے زمانہ اور کام کے حلقہ کو چند مخصوص حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً مذہبی تعلیم کا کام۔ اصلاح معاشرت و تہذیب رسوم کا کام۔ اقتصادی فلاح و بہبود کا

کام۔ قومی تنظیم کا کام، مذہبی تعلیم کے لئے مسجد مکتب اور مدرسہ کی تعمیرات ضروری ہوگی۔ اصلاح معاشرت کے لئے وعظ اور پروپاگنڈ کا مستقل ادارہ درکار ہوگا۔ اقتصادی فلاح و نجاح کے لئے کوآپریٹو سوسائٹی اور بیت المال جاری کرنا ضروری ہوگا۔

**تقسیم زمانہ**۔ سب سے اول اچھوتوں کو مسلمان بنانے کے لئے نماز روزہ، ارکانِ دین کی مکاتب و مساجد کے ذریعہ عملی تعلیم ضروری ہوگی محض کلمہ پڑھا کر ملکانوں کی طرح اُن کو برائے نام مسلمان بنانا بیکار سے بھی بدتر ہوگا۔ مکاتب مساجد کا سلسلہ ایک مستقل سلسلہ اور خیر جاریہ ہوگا۔ لیکن اس کی تاسیس کا ابتدائی کام میرے خیال اور اندازہ کے مطابق بیس سال کی مسلسل جد و جہد کا طالب ہوگا۔ اصلاح معاشرت اور تہذیب رسوم کے لئے کم سے کم پچاس سال کا جہاد ضروری ہوگا، اونچ جاتیوں کی اقتصادی تابعداری اور تعدی سے آزادی کا مسئلہ دو نوعیت کا ہوگا۔ ایک ابتدائی اور فوری ریلیف کی ضرورت ہوگی۔ جس طرح زلزلہ اور سیلاب جیسے آسمانی انقلابات کے باعث مصیبت زدوں کی امداد کے لئے ریلیف سوسائٹیاں بنتی ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کو مظلوم اچھوتوں کی ریلیف کے لئے مالی سامان سے لیس ہو کر ریلیف پارٹیوں کے ساتھ اُنکی دست گیری کے لئے تیار رہنا پڑے گا کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جوں ہی وہ مسلمان ہونا شروع ہونگے۔ ہندو جاگیردار ہندو مہاجن اور ہندو سورما اُن پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اُن کے مکانات کو لوٹینگے۔ اُن کو نوکریوں سے برخاست کرینگے۔ اُن کو اپنی زمینداریوں سے خارج کرینگے۔ اگر وہ رعیت بالمرضی ہیں تو اُنکے کھیت اُن سے چھین لینگے اور اگر وہ خود کاشت ہیں تو اُنکی کھیتی اور کھلیان جلا دینگے۔ الغرض اُن پر ہر طرف سے نرغہ کرینگے۔ یہ باتیں صرف قیاسی نہیں ہیں۔ اچھوتوں کی تحریک نے حقیقت میں ناسک۔ اورسی پی کے مقامات میں بالکل یہی حالت پیدا کر دیئے ہیں مسلمانوں کو ان خاص مصائب و شدائد کے مقابلہ کرنے کے لئے روپیہ اور آدمیوں سے تیار رہنا پڑے گا۔

میرے خیال میں یہ ابتدائی مصیبت کا زمانہ دس پندرہ سال کا ہوگا۔ لیکن اقتصادی آزادی اور فلاح کا دار و مدار ملک کے عام حالات اور مدت مدید کی مسلسل جد و جہد پر ہے اسلئے میرے خیال میں اس کے لئے ایک نامعلوم وقت کی ضرورت ہوگی۔ تاہم پچاس سال کی مسلسل کوشش سے ہمیں توقع ہے کہ اچھوتوں کی حالت اتنی بہتر ہو جائے گی کہ وہ پوری طرح مسلم ملت میں جذب

ہو جائیں گے، اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اپنی آئندہ بہتری کی جنگ لڑ سکینگے۔

**تقسیم حلقہ۔** ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اچھوتوں کی اصلاح کا کام مختلف صوبوں میں مختلف قسم کا ہوگا اچھوت مختلف صوبوں میں مختلف نسلوں سے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ مختلف رسم و رواج کے پابند ہیں۔ مختلف پیشے کرتے ہیں۔ بحیثیت نسل، کلچر اور زبان اُنکے کئی گروپ ہیں اور ہر گروپ کے لئے اُن کی مخصوص ضروریات اور نفسیات کے مدنظر مختلف حلقہ ہائے تبلیغ اور مختلف جماعتہائے مبلغین منظم کرنا پڑینگی۔ ان مبلغوں کے لئے اپنے حلقے کی زبان، تہذیب تاریخ اور جغرافیہ سے آگاہی ضروری ہوگی۔ مثلاً مالابار، کوچین، اور مدراس، کے اندر ہمیں ملایلم، ٹیلوگو، اور ٹامل بولنے والے مبلغ درکار ہونگے۔ اور یہاں کام کی نوعیت دوسری ہوگی مہاراشٹر اور گجرات میں مرہٹی اور گجراتی جاننے والے مبلغ درکار ہونگے۔ چھوٹا ناگپور، یوپی، بہار، اور بنگال میں مختلف حالات ہیں۔ اور ان کا لحاظ ضروری ہوگا۔

بنابریں ہندوستان کو سوشیالاجی، زبان اور کلچر گروپ کے لحاظ سے کئی مخصوص حلقوں میں تقسیم کرنا پڑے گا اور ہر حلقہ کے لئے اس کی زبان و معاشرت کے لحاظ سے مبلغین کا سامان کرنا پڑے گا۔ مثلاً ٹیلوگو۔ حلقہ ٹامل، کناری حلقہ، ملایلم۔ حلقہ کورگ حلقہ۔ مہاراشٹر حلقہ، گجرات حلقہ، چھوٹا ناگپور حلقہ۔ ہندی حلقہ (بہار اور یوپی) بنگالی و آسامی حلقہ پنجابی حلقہ وغیرہ

**پنجاہ سالہ پلان کے عناصر۔** پنجاہ سالہ پلان کے اس خلاصہ میں جو طلوع اسلام میں درج ہوا ہے کچھ معمولی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اس لئے ناظرین کے سامنے اُس کا خاکہ دوبارہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) ایک آل انڈیا مسلم مشن خاص پست ماندوں کے لئے "مسلم مشن برائے پست ماندگان ہند" قائم کیا جائے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ موجودہ مقامی یا صوبجاتی تبلیغی مجالس سے فائدہ نہیں اُٹھایا جائے بلکہ یہ ضروری ہے کہ اُن کے عناصر کی ترکیب سے مرکزی ادارہ کی تاسیس کی جائے کرالا مالابار، مدراس، پونا، وغیرہ میں تبلیغی مجالس ہیں اُن کو اسی دائرہ میں لایا جائے۔ مشن کا صدر مقام مدراس یا بمبئی میں ہو۔

(۲) ایک کروڑ روپے مستقل فنڈ کو بطور وقف خاص جمع اور محفوظ کیا جائے اس تمام جائیداد کو

سرمایۂ سیال (Liquid Fund) میں رکھنا ضروری نہیں ہے اس کا ایک بڑا حصہ عمارتی یا زمینی تعمیرات کی شکل میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس کا تیسرا حصہ ملازمین و کارکنان کے گذارہ کے لئے ریزرو فنڈ کی طرح بینک میں جمع کیا جائے اسی طرح مختلف مدات کے لئے دس دس سال کا میزانیہ تیار کیا جائے۔

(۳) ایک لاکھ "لائف ممبر" اس "مسلم مشن برائے پسماندگان ہند" کے لئے سارے ملک سے بھرتی کئے جائیں۔

ممبروں کی داخلہ (فی) پانچ روپے اور سالانہ فی ایک روپیہ ہوگی۔

(۴) ایک ہزار ذی حیثیت مسلمان، سارے ہندوستان سے مشن کے "لائف سرپرست" بنائے جائیں سرپرستوں کے لئے ایک ہزار روپیہ یکمشت اور ایک سو روپیہ سالانہ دینا ضروری ہوگا۔ جو حضرات نقد روپے کی جگہ خام اجناس، یا جائیداد مشن کے نام وقف کرنا چاہیں تو وہ بھی سرپرست ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اُن کی قیمت کم سے کم ایک ہزار روپیہ ہو۔

ممبروں اور سرپرستوں کی جماعت مشن کی حکمران طاقت ہوگی اور بحیثیت مجموعی جماعت ناصرین کہلائے گی۔

(۵) ایک ہزار "لائف ورکر" (مدت العمر کام کرنے والے کارکن) منظم کرنا چاہئے۔ یہ کارکنان پانچ قسم کے ہونگے۔

(الف) ممبروں اور سرپرستوں کی "جماعت ناصرین"

(ب) دفتری منتظمین اور منصرمین کی "جماعت ناظمین"

(ج) دینیات کے فارغ التحصیل طلبا کی جماعت جو چھوتوں کے خاص حلقوں، مسجدوں، مکتبوں اور مدرسوں میں تعلیم دین و اصلاح معاشرت کا کام کرینگے۔ ان کا اصلاحی نام "جماعت معلمین" ہوگا،

(د) تعلیم یافتہ ہنود۔ اور ہر دو کے درمیان شہری حلقوں میں تبلیغ کے لئے جدید خیالات سے واقف مبشرین۔ ان کے لئے انگریزی جاننا ضروری ہوگا۔ ان کا نام "جماعت مناظرین" ہوگا۔

(ہ) چونکہ پسماندوں میں تجربہ ہے، خود ہری جن قوم کے مبلغ جو ان کے عادات سے واقف

ہوں سب سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں، لہٰذا قابل اور ہونہار، ہر بچن کی سب سے بڑی جماعت تیار کرنی ضروری ہوگی۔ ان کا خاص کام اچھوتوں میں گھومنا، اور کام کرنا ہوگا۔ ان کا نام "جماعت مبلغین" ہوگا۔

(۶) مبلغین کی تعلیم و تیاری کے لئے خاص خاص حلقوں میں **دارالمبلغین** (ٹریننگ اسکول) قائم کئے جائیں۔ ان کو ہر حلقہ کی زبان، تاریخ اور اجتماعیت کا خاص درس دینا ضروری ہے۔

(۷) ایک مرکزی مالی ادارہ بنام **میشن ٹرسٹ**۔ میشن کے مالیات کے انصرام کے لئے قائم کیا جائے۔ اس کے ڈائرکٹر، ہندوستان کے چوٹی کے لوگ ہوں تاکہ کسی کو اس کی صلاحیت پر شبہ نہ ہو۔

(۸) پانچ ارکان کی ایک مستقل مالی کمیٹی قائم کی جائے۔ تاکہ وہ ٹرسٹ کے مالی فرائض کو عملی طور پر انجام دیا کرے۔

تمام لائیف ورکرز کو اچھی تنخواہ (یعنی کم سے کم ایک سو سے دو سو روپیہ تک) دی جائے۔ اور اُس کو تیس سال کی سروس کے بعد پنشن بھی دی جائے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا۔ اطمینان کے ساتھ کارکنوں کا کام کرنا۔ اور اپنی زندگیاں اُس کے لئے وقف کرنا معیشتاً مشکل ہوگا۔

میشن کا ممبر اور سرپرست ہر وہ کلمہ گو ہو سکتا ہے جو وحدت باری اور ختم نبوت کا عقیدہ رکھتا ہے۔

اس میشن کو کسی مذہبی فرقہ بندی اور سیاسی پارٹی بازی سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا یہ کامل یکسوئی، یکجہتی اور استقلال کے خالصاً لوجہ اللہ تبلیغ اسلام اور خدمت بنی نوع انسان کام کرے گی۔ کارکنوں اور مبلغوں کے چننے میں اُن کی ظاہری صلاحیت سے بہت زیادہ خیال اُن کی خوش اخلاقی، دینداری اور للّٰہیت کا کیا جائیگا۔ مسلم میشن اور اُس کے مشنریوں کے سامنے زمین پر اللہ کی بادشاہت قائم کرنے اور خدا کے بندوں کو بھائی بنانے کا عظیم الشان مذہبی نصب العین ہوگا

**چند اعتراضات اور اُن کا جواب**۔ پنجاہ سالہ تبلیغی پلان پر بعض حضرات نے کچھ تنقید فرمائی ہے۔ ایک بھائی نے سرے سے پلان اور تنظیم ہی کے طریقے کی مخالفت کی ہے اس کا جواب دیا جا چکا ہے ایک بھائی کو بعض اصطلاحی ناموں سے کچھ اختلاف ہے۔ ناموں سے کیا ہوتا ہے۔ آپ شوق سے دوسرا مناسب نام رکھ لیجئے تاکہ کارکنوں کی مجوزہ فوج میں ایک ترتیب و تقسیم بلحاظ وظائف مخصوصہ پیدا ہو جائے

لیکن سب سے بڑا اعتراض یہ کہ ہے کہ ایک کروڑ روپیہ مسلمانوں جیسی غریب قوم نہیں جمع کر سکتی ہے۔
نہایت ادب کے ساتھ جواب ہے کہ اگر ہندو اپنے سیاسی سوراج کے لئے ایک کروڑ روپیہ کا تلک سوراج فنڈ جمع کر سکتے ہیں تو مسلمانان ہند، ہندوستان کے اسلامی سوراج کے لئے دو کروڑ روپیہ جمع کر سکتے ہیں بشرطیکہ آج کوئی محمد علیؒ کے دل و جگر کا مجاہد میدان عمل میں آکر سرگرم جہاد ہو جائے۔ تعجب ہے کہ آج مسلمانوں کے افلاس پر ماتم کیا جاتا ہے حالانکہ انہیں سات کروڑ مسلمانوں نے تحریک ترک موالات کے زمانہ میں ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ چندہ مختلف فنڈوں میں جمع کیا تھا۔ پھر انھیں مسلمانوں نے تنہا ایک علیگڈھ کے لئے کروڑ روپیہ سے بہت زیادہ دیا ہے اور یہی مسلمان سالانہ کروڑ روپیہ سے زیادہ زکوٰۃ، صدقات اور اوقاف کی شکل میں نکالتے ہیں اور کروڑوں کا ٹرسٹ رکھتے ہیں، ایک ایک سال میں ایک ایک مخیر مسلمان لاکھوں کی جائیداد وقف کرتا ہے۔ اچھوتوں کے کام میں زکوٰۃ، صدقات، اوقاف، تبلیغ اسلام، تعمیر مساجد اور تعلیم دینیات کا سب روپیہ خرچ ہو سکتا ہے۔
ہمارا خیال ہے کہ اگر مسلمان اچھوتوں کے مسلمان بنانے کی سیاسی اہمیت کو بخوبی سمجھیں تو وہ خلافت فنڈ اور علیگڈھ فنڈ سے بھی بہت زیادہ روپیہ اس کام کے لئے جمع کر سکتے ہیں۔ ضرورت صرف صحیح احساس اور جوش مذہبی کی ہے۔

**سوراج بذریعہ اسلام کا نصب العین۔** غور کرنا چاہئے کہ پست ماندوں کے مسلمان بننے کے بعد ہندوستان کا سیاسی مستقبل کس کے ہاتھ میں ہوگا۔ بقول سر البین راج کمار بینرجی ہندو دنیا ایک عظیم الشان سوشیل انقلاب کے دروازہ پر کھڑی ہے۔

بقول سر ہری سنگھ گوڑ، وائس چانسلر ناگپور یونیورسٹی۔ آٹھ کروڑ مسلمانان ہند دراصل ہندو سماج کے مسلم ہیں اور چند سالوں کے اندر دس کروڑ اچھوت، ہندو سماج کے حلقہ سے اور خارج ہونے والے ہیں اور ہندو ازم فنا کی راہ پر ہے۔

سر ہری سنگھ کا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے۔ اس وقت کوئی نہیں بتا سکتا۔ لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ دس کروڑ پست ماندگان ہند، ہندو دھرم سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں میرے خیال میں یہ ہندوستان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اس کے صحیح فیصلہ پر اس کے تمام تر مستقبل کا دارومدار ہے۔ اگر مسلمان، ہندوستان کو ایک آزاد نیشن اور اپنی قومی سلطنت بنانا چاہتے ہیں تو پھر ایک کروڑ روپیہ

کوئی چیز نہیں درآنحالیکہ خود اچھوت لیڈر اسی سیاسی نصب العین کے ساتھ علانیہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ چنانچہ مسٹر سوکو مارن۔ بی۔ اے۔ جو مالا بار کے ایک اچھوت لیڈر ہیں علانیہ اس کی تبلیغ کر رہے ہیں کہ ہندوستان کا سوراج یا ہوم رول صرف اسی وقت ممکن ہے جب اس ملک کی غالب تعداد مسلمانوں کی ہو جائے۔ اور اس لئے اچھوتوں کو چاہئے کہ وہ مسلمان ہو جائیں کیونکہ اس طرح وہ اپنی معاشرتی نجات کے ساتھ خود ہندوستان کی سیاسی وحدت اور آزادی کے مسئلہ کو بھی حل کرینگے۔

ڈاکٹر امبیدکر صاحب کے ایک سابق سکرٹری نے حال میں یہ معنی خیز اعلان کیا ہے کہ مسلمان ڈاکٹر موصوف کی حقیقی مدد نہیں کر رہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ فوراً اچھوت آبادیوں میں منظم طور سے جم جائیں اور کافی روپیہ اور سامان سے لیس ہو کر کام شروع کر دیں۔ صرف اُنکے پاس ہمدردی کے تار بھیجنا بیکار ہے۔

ہم نہیں دیکھتے کہ مسلمان ڈاکٹر امبیدکر اچھوتوں کی دعوت کا بلا پلان بنائے ہوئے کیسے جواب دسکیتے ہیں۔ یہ معاملہ چند شخصوں کا نہیں کروڑوں کی قوموں کا ہے۔ مسلمان ہندو سماج سے نکال کر اچھوتوں کو مسلم سوسائٹی کے اندر کیسے داخل کرینگے۔ کیا مسلمان اتنے بڑے کام کے لئے کسی تیاری، کسی تنظیم اور کسی فنڈ کو ضروری نہیں جانتے ہیں؟ میرے خیال میں اس کا جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ پلان اور فنڈ ضروری اور سخت ضروری ہے اور اس کے بغیر بنتا ہوا کام بگڑ سکتا ہے۔

**کام کیسے شروع کیا جائے۔** اب ایک اصل سوال یہ ہے کہ کام کیسے شروع ہو؟ -

میرے خیال میں پونا، بمبئی، مدراس کرالا، وغیرہ کی مقامی انجمنوں کو اپنا کام جاری رکھنا چاہئے، بقیہ مرکزوں میں پہلے مقامی ادارات منظم کرنا چاہئے اور ساتھ ہی ایک مرکزی ادارہ کی تاسیس کی بھی سعی جاری رکھنی چاہئے۔ کیونکہ اس میں تاخیر اچھی نہیں ہے۔

پنجاہ سالہ پلان کی کامیابی بلاشبہ چند بڑے دماغوں، بڑے دلوں اور بڑی جیبوں کے تعاون باہمی اور اتحاد کا محتاج ہے خدا کے فضل سے آٹھ کروڑ ملت اسلامیہ ہند میں دماغوں اور دلوں کا فقدان ہے اور نہ بڑی جیبوں کی کمی ہے۔ البتہ عظیم الشان تاریخی کام ایک تاریخی لیڈر کی قیادت کا ضرور محتاج ہے۔ دیکھئے خدا اپنا یہ مقدس کام کس سے لیتا ہے اور ہندوستان میں امت اسلامیہ کی اس تسخیر ثانی کی سعادت عظمیٰ کس محمود غزنوی، غوری اور محمد بن قاسم کے ہاتھ آتی ہے۔

# پیامِ مشرق

## یا

# گلہائے نوظہور

### از تراوشِ فکر ادیب شہیر ایران دکتور افشار نزیل بمبئی

ڈاکٹر افشار ایران جدید کے نہایت بلند پایہ ادیبوں میں سے ہیں۔ انہوں نے حضرت علامہ اقبال مدظلہٗ کی مشہور تصنیف پیام مشرق پر چند اشعار لکھے ہیں اور ان سے درخواست کی ہو کہ اگر پیام مشرق کیساتھ "گل ہائے نوظہور" کا اضافہ کر لیا جائے تو بہت خوب ہو گا۔ ڈاکٹر افشار نے اس قطعہ میں (جو درج ذیل ہے) گلہائے نوظہور کی ترکیب اسی مناسبت سے استعمال کی ہو — مدیر

اندیشہ داشتم چہ ز ہندوستاں برم
سوغاتے از سفر بہ بر دوستاں برم

ایراں کہ بوستان گل و بلبل است من
در حیرتم چہ تحفہ سوئے بوستاں برم

اقبال بردئے گرد و فراز آمدم ز در
گل ہائے نوظہور کہ زی گلستاں برم

نغمہ سرا شوند ہمہ بلبلان فارس
زیں نغز چامہ ہا کہ ز ہندوستاں برم

---

# سیاحت اندلس

مولوی غلام یزدانی ایم۔ اے ناظم محکمۂ آثار قدیمہ دولت آصفیہ حیدرآباد دکن

## قُرطبہ

باربعٍ فاقت الامصار قرطبة      منهن قنطرة الوادی وجامعها
هاتان ثنتان والزهراء ثالثةٌ      والعلم اعظم شیٔ وهو رابعها

ان اشعار میں قرطبہ کو دنیا کے اور چار شہروں پر چار وجہ سے ترجیح دی گئی ہے۔ اول پل جو وادی الکبیر پر بنایا گیا تھا۔ دوم جامع قرطبہ۔ سوم مدینۃ الزہرا اور چہارم علم و فضل۔ شاعر نے علم کے متعلق "اعظم شیٔ" لکھا ہے جو بالکل درست ہے۔ دنیا کی تہذیب اور علمی ترقی کی تاریخ میں یونان اور روما کے بعد اگر کسی مقام کا ذکر کیا جائیگا تو وہ قرطبہ ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی تک جب یورپ میں جہل کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ قرطبہ نے علم کی مشعل کو روشن رکھا اور ایک پاک اور سچے مذہب کی تلقین کے علاوہ فلسفہ اور الٰہیات، تاریخ و جغرافیہ، ہندسہ و نجوم طب و کیمیا، کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں اہل اندلس نے اپنی تحقیق اور کوشش اور جدت اور تیزی طبع سے دنیا کے علم و فضل میں نمایاں اضافہ نہ کیا ہو۔ ابن رشد اور ابن حزم، ابن باجہ اور محی الدین عربی ابن حیان اور ابن سعید، ابن جبیر اور ابو عبید البکری، ابن السمح اور ابن الصفار ابوالجعفر الغافقی اور ابوالصلت امیہ بن عبدالعزیز، ابوالعباس احمد بن مفرج اور ابن جابر ایسے نام ہیں جن کے فضل و کمال کے ورثے کو زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے ہرگز فراموش نہیں کر سکتا۔

میں اندلس کے علماء کے حالات پڑھ رہا تھا اس میں ایک حکیم کا بیان پڑھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ ان کا نام عباس بن فرناس تھا۔ یہ بہت سی چیزیں ایجاد کر چکے تھے۔ آخر میں ان کو ہوا میں اڑنے کی سوجی۔ اپنے بدن پر خوب پر لپیٹے اور بازو کے لئے دو بڑے بڑے پنکھ بنوائے۔ پھر ایک بلند مقام پر سے پر پھیلا کر ہوا میں اڑنا چاہا۔ لیکن دھم سے نیچے زمین پر آن رہے۔ اس قصے کے بیان کرنے سے

میری یہ غرض ہے کہ اندلسی دماغ کی تیزی اور جودت یہ چاہتی تھی کہ قدرت کے رازوں کو انسان کی راحت اور آسائش کے لئے آشکارا کردے۔ نجوم کی حرکات کو دریافت کرنے کے لئے ایسے ایسے اصطرلاب اور آلات بنائے کہ آجکل کے علماء ان کو دیکھکر دنگ ہوتے ہیں۔

علم کا گھر گھر چرچا تھا۔ قرطبہ میں اسّی سے زیادہ ابتدائی و اعلیٰ مدرسے تھے۔ غربا کی تعلیم کا بھی خیال تھا الحکم نے ستائیس مدرسے قرطبہ میں فقط مساکین کی تعلیم کے لئے جاری کئے۔ عورتیں بھی تعلیم سے محروم نہ تھیں۔ مزنہ، غالیہ، ریحانہ، حفصہ، سعدونہ، بنت زیاد، زینب، فاطمہ الشلوری، مریم الفیصولی ہزاروں میں سے چند نام ہیں۔ ان میں سے کوئی بادشاہوں کی منشی گیری کرتی تھی۔ کوئی قرأت میں شہرۂ آفاق تھی کوئی شاعرہ تھی اور اپنے کمال سے مردوں کو شرمندہ کرتی تھی۔ خطاطی میں بھی عورتوں کو خاص دخل تھا۔ ابن خیاض نے اپنی تالیف تاریخ قرطبہ میں لکھا ہے کہ فقط شہر کے شرقی جانب (الربض الشرقی) میں ایک سو ستر عورتیں کوفی خط میں قرآن لکھا کرتی تھیں۔

کتب خانوں اور علمی مجلسوں کے لئے قرطبہ کو خاص شہرت حاصل تھی۔ الحکم ثانی کے زمانے میں شاہی کتب خانہ کی فہرست چوالیس جلدوں میں تھی۔ اور کتابوں کی تعداد چار لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ بادشاہ کے قاصد دور دراز ملکوں میں جاتے تھے اور مستند جدید و قدیم تصنیفات کی نقل شاہی کتب خانہ کے لئے بہم پہنچاتے تھے کہتے ہیں جب ابو الفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی تالیف کی۔ تو بادشاہ نے ایک ہزار اشرفیاں مؤلف کو بھیجیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب کا ایک نسخہ اس سے پہلے کہ بغداد پہنچے اندلس پہنچ گیا۔ بادشاہوں کی دیکھا دیکھی امراء کو بھی کتابیں جمع کرنے کا شوق یہاں تک بڑھ گیا کہ تمول، تہذیب، شائستگی سب کا معیار نادر اور بیش بہا کتابیں ہوگئیں۔ جس امیر کے پاس زیادہ کتابیں ہوتی تھیں وہی زیادہ صاحب ذوق اور صاحب ثروت گنا جاتا تھا امراء آجکل کے امریکہ والوں کی طرح منہ مانگی قیمتیں دیتے تھے۔ جب سلطنت میں ضعف آیا تو یہ شوق گھٹ گیا بنی عامر کی وزارت کے زمانہ میں شاہی کتب خانہ کی کتابیں بکنے لگیں۔ اور بربروں کے دخل سے اور تباہی آئی۔

شاہان قرطبہ کے علمی کارناموں کی داستان بہت طویل ہے۔ میں نے اوپر کے اشارہ کے ضمن میں فقط اشارتاً چند باتوں کا ذکر کر دیا ہے۔ اب میں شہر کے چند قدیم آثار کا حال سناؤنگا۔ جامع قرطبہ کو دیکھنے کے لئے مدتوں سے شوق دامنگیر تھا۔ ہماری ٹرین قرطبہ نو بجے صبح کے قریب پہنچی ہوگی۔ رات میں اچھی طرح سے سویا بھی نہ تھا کیونکہ مرسیہ سے قرطبہ تک آنے میں ریل دو دفعہ بدلی گئی۔ لیکن کسل اور تکان کا مطلق خیال نہیں آیا۔ ہوٹل میں

اسباب رکھکر سیدھا مسجد پہنچا اور ایک عجیب وغریب منظر دیکھا صدر دروازہ سے داخل ہوتے ہی ستونوں کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آیا۔ آخر میں قدیم مقصورہ کے قریب جو بادشاہوں کی نشست کا مقام تھا ایک محراب ہے اس کے بالائی حصے میں کمانوں کا جال کمال صنعت سے باندھا ہے۔ قریب سے دیکھنے سے تو ایک معمولی سی ترمین کاری معلوم ہوتی ہے لیکن دور سے خصوصاً دروازہ کے پاس سے ہیئتی اثر Perspective Effect صانع نے ایسا رکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے وابستہ کمانوں کا جال کوسوں چلا گیا ہے اس کمان سے آگے بڑھ کر جو حصہ آتا ہے اس کو تاریک رکھا ہے اور آخر میں قبلہ کی محراب ہے جس کے زرنگار کام کی آب وتاب کے لئے کھڑکیوں میں سے روشنی کا انتظام ہے۔ اس ترتیب کی غرض معمار Architect نے خبر نہیں کیا رکھی ہے۔ لیکن میرے اشیائی دماغ میں تو یہ آئی۔ ستونوں کا لامتناہی سلسلہ تلاش حق کیلئے بے تعداد راستے ہیں۔ مقصورہ کے پاس کی کمان اہل طریقت کے لئے وہ منزل ہے جو دور سے تو پیچ در پیچ اور بھول بھلیاں معلوم ہوتی ہے لیکن مقصود پر پہنچنے کے بعد بالکل صاف نظر آتی ہے۔ تاریک حصہ پردۂ خفا ہے۔ اور زرنگار محراب نور حق۔ عام لوگ اس نور کی جھلملاہٹ ہزاروں پردوں میں مستور دیکھتے ہیں۔ لیکن اہل نظر حسن بریلا کا لطف اٹھاتے ہیں قوطی کنیساؤں Gothic Cathedrals کی عمارت کی رفعت، آرائش کی نزاکت اور پیچیدگی اور اندرونی تاریکی میں ہزاروں مذہبی رموز پنہاں پائی جاتی ہیں۔ اندلس کی عمارتوں کے بنانے والوں کے دل میں ایک خاص دینی تعلیم کے خیالات موجزن تھے جن سے واقف ہوئے بغیر عمارات کی اور ترتیب کی خوبی کا پورا لطف اٹھانا ناممکن ہے۔

قرطبہ اسلامی زمانے سے قبل بھی ایک پررونق شہر تھا چنانچہ رومانوی تاریخ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ جس مقام پر اب مسجد واقع ہے۔ یہاں ایک قدیم رومانوی معبد تھا[1]۔ قوطیوں کے زمانے میں یہ عمارت عیسائی گرجا بن گئی۔ اور جب مسلمان آئے تو آدھے حصہ میں اسلامی عقائد کے موافق نماز ہونے لگی۔ لیکن آدھا نصرانیوں کے قبضہ میں رہا۔ دمشق میں بھی جامع امویہ کی تعمیر سے قبل رومانوی معبد کے آدھے حصے پر مسلمانوں کا قبضہ تھا اور آدھے میں عیسائی اپنے دین کے موافق پرستش کرتے تھے۔ غیر مذاہب کے مصنف جب اسلامی حکومت پر

---

[1] دو رومانوی ستون جو حال میں برآمد ہوئے ہیں اور اب مسجد کے دروازے پر نصب کر دیئے گئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ معبد Temple of Janus کا فاصلہ قادس Gades سے ۱۱۶ میل تھا۔

تنقید کرتے ہیں تو اس انصاف پسندی اور مراعات کو بالکل بھول جاتے ہیں جو مسلمان بادشاہوں نے غیر دین والوں کے ساتھ برتیں۔ قرطبہ کی فتح کے تقریباً اسّی برس تک رومانوی معبد میں مسلمان اور عیسائی پہلو بہ پہلو خدائے ذوالجلال کی عبادت کرتے رہے۔ لیکن عبدالرحمٰن اول کی حکومت کے آخری زمانہ میں جب قرطبہ میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہوگئی۔ اور ایک بڑی عبادت گاہ بنانے کی ضرورت لاحق ہوئی تو بادشاہ نے ایک لاکھ دینار (تین لاکھ روپیہ) دے کر تمام معبد کو خرید لیا۔ اور ایک عظیم الشان مسجد کی بنیاد ڈالی۔

کہتے ہیں اس مسجد کی طرز میں قیروان کی مسجد کی نقل کی گئی ہے جو ایک حد تک درست ہے۔ لیکن قرطبہ کی مسجد میں دو منزلی کمان فن تعمیر کی تاریخ کے لحاظ سے پہلی دفعہ بنائی گئی[1]۔ اور نعل نما محراب بھی گو افریقہ میں پہلے استعمال ہو چکی تھی لیکن وہاں اس کا بالائی حصہ ہمیشہ نکیلا ہوتا تھا۔ Pointed یہاں پہلی دفعہ بالکل گول بنایا گیا۔ حلقہ دار محراب Multifoil cusped بھی شرق اور غرب میں پہلے کہیں نہیں بنی تھی۔ اور یہاں اول مرتبہ بنائی گئی۔ ان خصوصیات کے علاوہ عمارت کے تکلفات میں جدت اور نفاست طبع کے وہ کمال دکھائے کہ عمارت اُسی زمانہ میں عجوبہ روزگار سمجھی جانے لگی تھی۔

عبدالرحمٰن اول نے مسجد کی بنیاد جس نقشہ پر ڈالی تھی اس سے دالانوں کی تقسیم قبلے (جنوب) کی جانب اکیس قطاروں پر اور شرقی و غربی جانب گیارہ ایوانوں پر منقسم تھی۔ بیچ کا ایوان ادھر اُدھر کے ایوانوں سے زیادہ وسیع تھا۔ اور ایک جانب صدر دروازے کے اور دوسری جانب محراب کے مقابل تھا۔ چھتیں چوبی تھیں جن پر نہایت نفیس منبت کاری کی گئی تھی اور طلاء اور رنگ آمیزی کا کام بھی۔ رنگ آمیزی میں زمین لاجوردی یا شنگرفی رکھی گئی تھی۔ اور پھول پتے سنہری تھے[2]۔ سلطان عبدالرحمٰن اول کی زندگی میں ان کے نقشہ کے موافق عمارت تکمیل کو نہ پہنچی گو ان کے عہد میں اسی ہزار دینار (دو لاکھ چالیس ہزار روپیہ) تعمیر پر خرچ ہو گئے تھے۔

---

؎۱ اول ستونوں پر محرابیں قائم کی گئیں لیکن چھت کے لحاظ سے وہ کافی بلند نہ تھیں۔ اس لئے ستونوں پر پائے چن کر نیچے کی محرابوں کے اوپر ایک اور محرابوں کا سلسلہ قائم کر دیا۔ اس سے عمارت میں لطافت پیدا ہوگئی اور ٹھوس دیواروں کے بنانے سے جو تاریکی پیدا ہوتی وہ نہ ہوئی۔ ؎۲ امتداد زمانہ سے کڑیاں چونکہ بعض جگہ سے ضائع ہوگئی تھیں۔ اس لئے ترمیم میں چوبی چھتوں کی بجائے قوطی طرز کی ڈاٹ دار چھتیں بنائی گئیں ہیں یہ تو ایک حد تک جائز تھا لیکن مرمت کرنے والوں نے یہ کمال کیا کہ تمام مسجد کی چھت کو یکساں کرنے کیلئے جہاں کڑیاں ثابت بھی تھیں وہاں بھی قدیم چھت کے نیچے ڈاٹیں قائم کر دیں۔ اب پروفیسر ولسکٹ جن کی نگرانی میں مسجد کی اصلاح و ترمیم ہے ان ڈاٹوں کو تڑوا کر پرانی چھت کی ترمیم کر رہے ہیں۔

ہشام نے باپ کی وفات کے بعد مسجد کے کام کو جاری رکھا اور ۷۹۳ء میں عمارت بنکر تیار ہوگئی۔ ہشام کے بعد ہر اموی سلطان نے مسجد میں کچھ نہ کچھ اضافہ کیا[15]۔ جب خلیفہ الناصر تخت نشین ہوئے تو انھوں نے مینار کو جو مسجد کے شایان نہ تھا تڑوا کر از سر نو تعمیر کر دیا۔ مینار موذن کے کھڑا ہونے کے مقام تک ۵۴ گز بلند تھا اور کلس کے طلائی انار تک کل ارتفاع ۷۳ گز تھا۔ مینار کی ہیئت مربع تھی اور ہر ضلع کی مساحت ۱۰ گز تھی۔ چڑھنے اُترنے میں تکلف دشواری نہ ہو اس لئے دو علیحدہ علیحدہ زینے رکھے گئے تھے۔ یہ خصوصیت مصر اور شام کے اکثر قدیم میناروں میں پائی جاتی ہے اور بیدر کے مدرسۂ محمود گاواں کے مینار میں بھی موجود ہے اندلس میں یہ مشہور تھا کہ اس مینار سے بلند کوئی مینار دنیا میں نہیں ہے۔ ابن بشکوال اس تعلی پر اعتراضاً کہتے ہیں کہ یہ وہ کہیں جنھوں نے مراکش اور اشبیلیہ کے مینار نہ دیکھے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مراکش اور اشبیلیہ دونوں جگہ کے مینار قرطبہ کے بعد بنے اور جس زمانہ میں کہ قرطبہ کی مسجد کا مینار بنا تھا وہ بے شک بے مثل تھا۔

مینار کے اوپر تانبے کا کلس تھا جس میں تین لٹو تھے۔ اوپر اور نیچے کے لٹو خالص سونے کے تھے اور بیچ کا چاندی کا۔ چاندی کے لٹو پر چھ پتی کا سوسن کا پھول بھی بنا ہوا تھا۔ عیسوی تسلط کے بعد مینارے کی ہیئت بدل گئی اور سولھویں صدی میں زلزلہ سے بھی بہت صدمہ پہنچا۔ موجودہ مینارہ کا صرف نیچے کا حصہ قدیم ہے اور باقی سب نیا۔ الحکم (۹۶۱ تا ۹۷۶ء) کے زمانہ میں مسجد کی وسعت مصلیوں کی تعداد کے لحاظ سے غیر مکتفی معلوم ہونے لگی اس لئے قبلہ کی جانب آٹھ دالان بڑھائے گئے۔ پہلی محراب کو شہید کر کے ایک اور محراب بنائی گئی اور بادشاہ کی نشست کے لئے نیا مقصورہ بنا۔ صحن کو بھی وسعت دی گئی۔ اور وضو کے واسطے چار حوض بنوائے۔ ان میں سے دو بڑے مردوں کے واسطے، اور دو چھوٹے عورتوں کے لئے۔ دروازوں میں بھی سقایے بنائے گئے تھے مسجد کے غربی جانب ایک دار الصدقہ بھی تعمیر ہوا۔ ان عمارات پر الحکم نے ایک لاکھ اکسٹھ ہزار دینار (چار لاکھ تراسی ہزار روپیہ) صرف کئے۔ یہ کل رقم خمس کے خزانہ سے لی گئی تھی۔

مقصورہ کا مسجد میں اب نشان تک باقی نہیں لیکن قدیم کتابوں میں جو کیفیت درج ہے اس سے معلوم

---

[15] خلیفہ عبد الرحمن الثانی (۸۲۱ تا ۸۵۲ء) نے جنوبی طرف کے گیارہ دالانوں کی تکمیل کی اور چند رواقوں کے علاوہ ایک نئی محراب بھی تعمیر کی۔ اشبیلیہ اور مراکش کے میناروں کو ابو یوسف یعقوب نے بنوایا تھا۔ اس کا عہد سلطنت ۵۸۰ ہجری (۱۱۸۴ء) سے ۵۹۵ ہجری (۱۱۹۹ء) تک ہے قرطبہ کے میناروں کی بنیاد ۳۴۰ ہجری میں پڑی یعنی ان میناروں سے ۲۵۰ برس قبل۔ اس لئے قرطبہ والوں کا فخر کچھ بیجا نہ تھا۔

ہوتا ہے کہ دیواریں نہایت خوبصورت لکڑی کے کام کی تھیں اور تین جانب (شرق اور غرب اور شمال میں) نفیس دروازے تھے۔ جنوبی حد مسجد کے قبلے کی دیوار سے ملی ہوئی تھی۔ اور عرض ۲۲ ذراع تھا۔ اس زمانہ کے گز کا اندازہ ہونا مشکل ہے۔ لیکن تاریخ میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ مقصورہ اضافہ شدہ گیارہ دالانوں میں سے پانچ دالانوں میں قائم کیا گیا تھا اور چونکہ یہ دلان قبلہ کے رُخ بڑھائے گئے تھے اور اسی جانب مقصورہ کے عرض کی بھی وضاحت کی گئی ہے اس لئے مقصورہ کی چوڑائی کو پانچ دالانوں کی چوڑائی کے مساوی سمجھنا چاہئے۔ طول کے متعلق یہ درج ہے کہ ۷۵ ذراع تھا یا یوں سمجھئے کہ عرض سے پانچ گنا تھا۔ دیواروں کا ارتفاع کنگروں تک ۸ ذراع تھا اور کنگروں کی اونچائی تین بالشت تھی۔ افریقہ کی بعض مساجد میں مقصورے اب تک موجود ہیں[1]۔

محراب اور اس کے سامنے کا حصہ اب تک محفوظ ہے۔ اس کی چشم دید کیفیت میں آپ کو سُناتا ہوں۔ جنوبی دیوار میں تین نعل نما محرابیں ہیں انکی روکار بلور کے پتھروں سے جو سنہری اور مختلف رنگوں کے ہیں آراستہ ہے۔ یہ بازنتینی صنعت ہے اور اس کام کے لئے صاحب فن قسطنطنیہ سے آئے تھے۔ بیچ کی محراب پہلوؤں کی دونوں محرابوں سے زیادہ آراستہ ہے۔ اس کی اندرونی ہیئت ہفت پہلو ہے۔ ہر پہلو میں سنگ مرمر کی سلیں نصب ہیں جن کے بالائی حصہ پر سنہری حروف کا نفیس حاشیہ ہے۔ حاشیہ کے اوپر سنگتراشی کے کام کی کنگنی Cornice بنی ہوئی ہے۔ کنگنی پر سنگ مرمر کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ستون ہیں۔ جن پر تین تین حلقے کی محرابیں قائم کی گئی ہیں۔ دیواروں کے گوشوں پر سنگتراشی کا کام نہایت نازک ہے محرابوں کے اوپر کتبوں کا ایک اور حاشیہ ہے اور اس حاشیہ پر انڈے کی شکل کا سنگ مرمر کا گنبد قائم کیا گیا ہے۔ پورا گنبد ایک ڈال کا ہے اور کٹاؤ کا کام نہایت نفیس ہے۔ اس محراب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن رکھا رہتا تھا۔ اس کی رحل اور جزدان اور جلد کی تزئین میں نجاری زردوزی اور جلد سازی کے کمال کو معراج پر پہنچا دیا تھا۔ مصحف کے بارے میں مورخین نے طویل بحثیں کی ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ ان چار قرآنوں میں سے تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوفے بصرے، شام اور مکہ معظمہ بھیجے تھے۔ اور ممکن ہے کہ یہ شامی نسخہ ہو۔ ایک اور مورخ لکھتے ہیں کہ شامی نسخہ ۷۶۵ھ تک جامع امیہ میں محفوظ تھا۔ معتبر رائے یہ ہے کہ یہ قرآن شریف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا لکھا ہوا نہ تھا۔ بلکہ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم نے جمع کیا تھا۔ شاہان اندلس مصحف کا بیحد احترام کرتے تھے۔ لیکن جب ہسپانیہ میں موحدین کا دور دورہ ہوا تو قرآن شریف اندلس

[1] مقصورہ سے شاہی محل میں جانے کے لئے ایک چور راستہ بھی تھا۔

سے مراکش پہنچ گیا[1] اور ۵۵۳ھ میں وہاں کی جامع مسجد میں رکھا گیا۔

صدر محراب کے دروازوں پر دونوں جانب دو ستون ہیں، ایک سیاہ سنگ مرمر کا اور دوسرا ابری کا مورخین نے یہ بیان کیا ہے کہ یہاں چار ستون دو لاجوردی اور دو سبز ایسے نفیس تھے۔ کہ ان کی قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کتبہ جو ان ستونوں کے پرکالون پر کندہ ہے اس میں اتنا درج ہے کہ خلیفہ المستنصر باللہ نے محراب کے ستونوں میں دو کا اضافہ کیا۔ یہ شرح نہیں ہے کہ آیا وہ لاجوردی تھے یا سبز۔

محرابوں کے سامنے ایک پیش دالان ہے جس کو جالدار پردہ کی کمانیں قائم کر کے تین حصوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ اس طرح کہ ہر محراب کے سامنے ایک مربع برآمدہ Ante-Chamber سا نکل آیا ہے۔ ان تینوں کی چھت گنبدی ہے۔ در و دیوار پر جو سنگ تراشی، طلاکاری، رنگ سازی اور پچکاری کی گئی ہے، وہ نفاست کے لحاظ سے دنیا میں آپ اپنی نظیر ہے۔ بلوری پچکاری Glass Mosiac کا کام میں نے وینس میں سینٹ مارک San Marco کے گرجا میں اور قسطنطنیہ میں مسجد ایا صوفیہ میں اور بیت المقدس میں قبتہ الصخرا اور مسجد اقصیٰ میں دیکھا لیکن کوئی مسجد قرطبہ کے کام کو نہیں پہنچتا۔

صدر محراب کے سامنے جو مربع برآمدہ ہے اس کی اندرونی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ قبلہ کے رُخ محراب کی دیوار ہے اس کو بلند کرنے کی غرض سے محراب کے اوپر سات نازک حلقہ دار Cusped کمانوں کا حاشیہ بنایا گیا ہے باقی تین ضلع جالدار محرابوں کے ہیں اس مربع کو گنبد کے واسطے مناسب کرنے کے لئے آڑی کمانوں کو اس خوبصورتی سے قائم کیا ہے کہ ان کے تقاطع سے گنبد کے لئے ایک ہشت پہلو بنیاد پیدا ہو گئی ہے اور خود کمانوں کے جال کی شکل ستارہ نما بن گئی ہے۔ پہلوؤں کے برآمدوں کے گنبد بھی کم و بیش اسی ترکیب سے قائم کئے گئے ہیں لیکن ان کی آرائش بیچ کے حصہ سے نسبتاً کم ہے۔

عرب کے مورخین نے محراب کے بیان کے ضمن میں منبر کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ آبنوس اور صندل اور سال اور طرح طرح کی قیمتی لکڑیوں کا بنا ہوا تھا۔ پچکاری اور گلکاری اس نزاکت سے کی گئی تھی کہ منبر میں ۳۶۰۰ جوڑ تھے جو سونے اور چاندی کی کیلوں سے ملائے گئے تھے۔ اس کی نو سیڑھیاں تھیں۔ منبر سات برس میں بنکر تیار ہوا اور ہر روز آٹھ کاریگر کام کرتے تھے اخراجات کا اندازہ ۳۵۷۰۵ دینار اور ۳ درہم (۱۰۷۱۱۵ روپیہ)

---

[1] نفح الطیب (جلد اول صفحہ ۲۹۸ الخ) میں قرآن شریف کی نقل و حرکت کا پورا ذکر ہے جن صاحبوں کو دلچسپی ہو وہ اس کتاب میں وضاحت کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔

ایک لاکھ سات ہزار ایک سو پندرہ روپیہ درج ہے۔ افریقہ شام اور مصر کی مساجد میں میں نے قدیم لکڑی کے منبر دیکھے ہیں۔ لکڑی پر گلکاری کا کام اس زمانہ میں بیحد نفیس ہوتا تھا۔

الحکم نے مسجد میں جو توسیع کی اس پر دو لاکھ اکسٹھ ہزار پانچ سو تینتیس دینار (سات لاکھ چوراسی ہزار سات سو گیارہ روپیہ) خرچ ہوئے۔ اس بادشاہ کے عہد کے بعد مسجد میں آخری بار توسیع منصور بن ابی عامر کے زمانہ میں ہوئی یہ بہت بڑا اضافہ تھا۔ مسجد کے دالانوں میں شرقی جانب آٹھ قطاریں اور بڑھائی گئیں اور صحن کو بھی بہت وسعت دی گئی۔ ایک نیا حوض وسط صحن میں بنایا گیا۔ تعمیر کا کام ڈھائی برس تک جاری رہا منصور کے شوق اور انہماک کا یہ حال تھا کہ وہ خود بھی مزدوروں کے طور پر کام کرتا تھا۔ صنعت اور کمال کے لحاظ سے مسجد کے اس حصہ کو جو منصور کے زمانہ میں تعمیر ہوا۔ کچھ زیادہ اہمیت نہیں ستونوں کے پر کالے سادی وضع کے ہیں محرابوں کی شکل اور چوڑائی میں تناسب نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر نقشہ تیار کئے محرابیں بنانی شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ آخر میں جہاں جگہ زیادہ چھوٹ گئی وہاں بڑی محراب بنادی اور جہاں جگہ کم رہ گئی وہاں پتلی کمان قائم کر دی۔ اسی طرح ایک مقام پر مقابل کی کمانوں کے لحاظ سے دو کمانیں ہونی چاہئیں تھیں وہاں تین کمانیں قائم کر دی ہیں۔

محرابوں کی شکل میں بھی یہی بے ڈھنگا پن رہا۔ بعض حلقہ دار Cusped ہیں بعض نعل نما بعض قوطی وضع کی مخروطی۔ دالانوں کا فرش بھی سنگ مرمر کا نہیں ہے۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید سیاسی وجوہ سے کام میں بہت عجلت کی گئی۔ ورنہ فن تعمیر میں اب تک کسی قسم کا انحطاط پیدا نہیں ہوا تھا۔ خود منصور کے قصر (جو قصر الزہرا یا قصر عامری کے نام سے مشہور ہے) کے آثار میں جدت بلندی خیال اور حسن ترتیب بدرجۂ اتم نمایاں ہیں۔

منصور کے زمانہ سے قبل مسجد میں تیل کے چراغوں کے جھاڑ تھے۔ منصور نے پہلی مرتبہ موم کی بتیاں روشن کرائیں۔ قدیم جھاڑ پیتل کے بنے ہوئے تھے اور بعض میں ہزار ہزار چراغ نصب تھے۔ تونس کی جامع زیتونہ اور مسجد قیروان میں اس قسم کے قدیم جھاڑ اب بھی موجود ہیں۔ چراغوں کی نسبت یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ وہ قدیم نصرانی کنیساؤں کی برنجی گھنٹیوں کو توڑ کر بنائے گئے تھے۔ محراب میں جو جھاڑ آویزاں تھا وہ سب سے بڑا تھا اور اس میں ۴۸۴ چراغ جلتے تھے۔ جھاڑوں کی تعداد مسجد کے اندر ۲۲۴ تھی اور باہر صحن اور دروازوں کے ملاکر ۲۸۰ تھے دقیقہ رس مؤلفوں نے موم بتیوں کے وزن اور سالانہ تیل بتی کے خرچ کی تفصیل دی ہے۔

اور یہ بھی بتایا ہے کہ رمضان المبارک میں کس قدر خرچ ہوتا تھا۔ اور معمولی دنوں میں کتنا۔ خوشبوؤں کا ذکر ہے کہ رمضان المبارک میں جس روز قرآن شریف ختم ہوتا تھا۔ اُس دن چار اوقیہ (پانچ سیر) عنبر اشہب اور آٹھ اوقیہ (دس سیر) عود رطب جل جاتا تھا اور ہر جمعہ کو آدھ سیر عود اور پاؤ عنبر دھونی (بخورات) کے لئے خرچ ہوتا تھا۔ مسجد کے عملے میں ۱۶۹ آدمی تھے۔ ان میں امام قاری، امین، موذن، جاروب کش اور روشنی کرنے والے سب شامل تھے۔ اسلامی زمانے میں مسجد کی جو شان تھی اس کی اجمالی کیفیت میں عرض کر چکا۔ اب اُن تغیرات کا ذکر کرونگا جو عیسوی تسلط کے بعد عمارت میں ہوئے ۱۲۳۶ء میں قرطبہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور مسجد میں کنیسا قائم ہوگیا۔ لیکن تعمیر مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی ۱۲۶۵ء میں شاہ فرونیند نے حکمدیا کہ چار مسلمان کنیساؤں کی تعمیر کے لئے متعین کئے جائیں اور ان سے کسی قسم کا خراج نہ لیا جائے۔ بعد میں بھی اس قسم کے فرمان جاری ہوئے۔ اس لئے عمارت میں جو کچھ تغیر و تبدل ہوا اس میں عمارت کی اسلامی شان نہ بدلی ۱۳۶۹ء میں جب شاہ قشتالہ نے اپنے باپ کی یادگار میں گرجا بنانا چاہا تو وہ بھی اسلامی ہی طرز پر قدیم مقصورے کے قریب بنایا گیا۔ لیکن عبدالرحمن اور الحکم ثانی کے زمانہ کی تعمیر سے اس زمانہ کی تعمیر میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا تھا۔ سلطنت میں ضعف آنے کی وجہ سے باریک چونے کی گلکاری، طلائی رنگ آمیزی اور چینی کے پتھروں کا کام اور اسی قسم کی ٹیپ ٹاپ کی چیزیں محبوب ہوگئیں اور پتھر کی منبت کاری یا پچکاری کا کام جس کا نام عربوں نے فسیفسا رکھا تھا اور اس میں زیادہ محنت اور استقلال کی ضرورت تھی ترک ہوگیا۔ اس گرجا میں چونے کا کام اور طلائی آرائش بہت خوب ہے۔

مسجد کے صحن کا صدر دروازہ بھی جس کا نام باب التوبہ Puerta del Perdón ہے اسی زمانہ کی تعمیر ہے۔ اس دروازہ کا پیتل کا کام نہایت نفیس ہے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو نہایت سلیقہ سے جوڑا ہے پتھروں پر کوفی خط میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کندہ ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ دروازہ کو مسلمان صناعوں نے بنایا تھا۔ لیکن ساتھ ہی مقابل کے پتھروں پر چار رومانوی حروف J. C. N. S. کندہ ہیں، غالباً یہ کسی ایسے جملہ کے مخففات ہیں۔ جس کا مطلب ہے شفیع ما نزر کرستو

Jesus Christ Our Saviour

مسجد کے اندر ان جزئی تغیرات سے اس قدر بدنمائی پیدا نہ ہوئی۔ لیکن جب ۱۵۲۱ء میں اسقف منریق کی استدعا پر عین مسجد کے وسط میں چارلس پنجم نے قوطی طرز کے مطرانی کنیسا بنانے کی اجازت دی تو یہ ایک ایسی

غلطی ہوئی جس پر وہ بعد میں خود ہی نقطہ نہ پہنچا یا۔ بلکہ اب تک ہر صاحب ذوق افسوس کرتا ہے۔ گرجا بطور خود ایک عمدہ عمارت ہے۔ لیکن مسجد کے اندر اس کا وقوع وحشیانہ حرکت معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں جب چارلس پنجم نے گرجا کو دیکھا تو اسقف سے کہا کہ یہ عمارت جو تم نے بنائی ہے وہ تم یا کوئی اور شخص باہر بھی بنا سکتا تھا۔ لیکن جس کو تم نے خراب کیا اس کی دنیا میں اب نظیر پیدا ہونا ناممکن ہے۔

اس بڑے گرجا کے علاوہ اُن یادگاروں نے جو مختلف شئیتوں کے نام سے مسجد کے بیرونی محرابوں میں چاروں طرف قائم کی گئیں عمارت کی روکار کو خراب کر دیا ہے۔ صحن کی جانب پہلے محرابیں کھلی ہوئی تھیں انکے بند ہونے سے عمارت میں تاریکی پیدا ہونے کے علاوہ اس کے حسن میں بہت بڑا دھبہ لگ گیا محرابوں کی ہیئت ساخت، موزونیت اور استحکام نویں اور دسویں صدی کے اسلامی طرز تعمیر کی عمدہ مثال ہیں۔ صحن کے باقی تین جانب جو دالان تھے وہ اب تک باقی ہیں لیکن ان کی محرابوں کی اصلی ہیئت کو اینٹ اور مصالحہ کی بھرتی نے بدل دیا ہے[۵]۔

صحن میں نارنگیوں اور کھجوروں کے درخت اب تک لگے ہوئے ہیں اور تین فوارے اور ایک حوض بھی موجود ہے حوض پر ہندوستان کے پن گھٹ کا لطف آتا ہے۔ یہ حوض اور فوارے بالکل سادہ ہیں اور عیسوی زمانے کے بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کے قدیم زمانہ میں ۲۱ دروازے تھے ان میں سے ۹ غرب کی جانب تھے اور ۹ شرقی رُخ میں اور تین شمال میں۔ ہر جانب ایک ایک دروازہ عورتوں کے لئے مخصوص تھا جس سے ان کے

---

[۵] دالانوں کے ستون اور ان کے سرکالے ( Capitals ) سادی وضع کے ہیں لیکن غربی جانب دروازہ کے پاس کے تین سرکالے نہایت نفیس عربی وضع کے ہیں۔ روکار کی محرابوں کے ستون اندر کے دالانوں کی ستونوں کی طرح اکثر رومانوی طرز کے ہیں مسجد کے کل ستونوں کی تعداد ایکہزار چار سو نوے تھی یہ اکثر قرطاجنہ اور افریقی شہروں سے آئے تھے اور ہسپانیہ کے قدیم رومانوی معبدوں سے بھی لائے گئے تھے لیون چہارم ( Leo IV ) شاہ قسطنطنیہ نے بھی بہت سا مسالہ اور کاریگر مسجد کی تعمیر کے لئے بھیجے تھے۔ ستون مختلف شکلوں اور مختلف طول اور ضخامت کے تھے لیکن مسجد کی تعمیر میں ان سب کو برابر صاف کر دیا۔ جو زیادہ لمبے تھے اُن کو تھوڑا زمین میں اُتار دیا ہے اور جو چھوٹے تھے تو اونچے سرکالے کر دیئے ہیں بعض بعض ستونوں کی ہیئت اور سنگتراشی اسقدر نفیس ہے کہ دل دیکھکر عش عش کرتا ہے لیکن اس میں مسلمانوں کی صنعت کو دخل نہیں عرب مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ تین ستون ایسے تھے جنکے جسم میں کلمۂ محمدی عصائے موسوی اور اصحاب کہف اور حضرت نوحؑ کے کوے کی تصاویر منقوش تھیں۔ علامہ مقری اس روایت پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اندلس کے کسی معتبر مورخ نے ان ستونوں کا ذکر نہیں کیا الا یہ کہ رجس کا قدیم نام ریہ ہے سنگ ابری نکلتا ہے اسکے جرم میں مختلف اشکال اور نقوش ہوتے ہیں جب میں غرناطہ میں تھا تو ایک گرجا میں مجھ کو ایسی پتھر کے جرم میں ایک شئیت کی تصویر دکھائی گئی تھی جو ہو بہو انسان کی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ ان وجوہ سے قرطبہ کی مسجد میں ایسے تین ستونوں کا ہونا جس پر مذہبی روایات اور اشکال منقوش تھیں بالکل قرین قیاس ہے۔

مقصورہ کا راستہ رکھا گیا تھا۔ اب صرف تین دروازے باقی ہیں ایک شمال میں ایک شرق میں ایک غرب میں یہ تینوں صحن میں ہیں۔ مسجد کے دالانوں میں جو دروازے تھے وہ بند ہو گئے۔ لیکن انکے نشانات غربی اور شرقی دیواروں میں بیرونی جانب باقی ہیں۔

عمارت کی بیرونی ساخت قلعہ نما تھی۔ محرابوں کے زور کو روکنے کے لئے سنگین پشتیبان Buttresses بنائے ہیں۔ جو قدیم عربی گرجھیوں کے مربع برجوں سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ چھت کی حفاظت کے لئے اوپر کویلوں کے ڈھالنے بھی ہیں۔ ان بدنما داغوں کو عمارت کے حسن سے رفع کرنے کے لئے کوشش ضرور کی گئی ہے۔ چنانچہ دیواروں پر جابجا خوبصورت محرابیں اور سنگتراشی کا کام کیا گیا ہے۔ جس سے وہ سختی جو پشتیبانوں نے پیدا کردی تھی ذرا کم ہو گئی ہے۔ چھت کے کویلوں کو چھپانے کے لئے بھی ایک خوبصورت کنگرہ نصب کیا گیا ہے لیکن باوجود ان باتوں کے عمارت کے اندرونی اور بیرونی حالت میں توازن جو فن تعمیر کے کمال کا جوہر ہے یہاں مفقود ہے۔ یہ تناسب قدیم یونانی عمارتوں میں قرون وسطےٰ کے قوطی طرز کے کنیساؤں میں اور ہندوستان کے مغلیہ زمانہ کی عمارتوں میں خوب موجود ہے۔ ایتھنز کے Erechtheum کو میلان کے مطرانی کنیسا Cathedral کو آگرہ کے تاج گنج کو خواہ باہر سے دیکھو خواہ اندر سے ان کا حسن یکساں ہے۔ افریقہ اور ہسپانیہ میں مسلمانوں کے فن تعمیر میں رومانوی طرز کا بہت بڑا عنصر شامل ہے اور ایک مخصوص قسم کی شوکت اور استحکام جو ہسپانیہ کی عمارات کی بیرونی ساخت میں پایا جاتا ہے وہ رومانوی میلان کا نتیجہ ہے۔ غرناطہ کی عمارات کے بیان میں اس موضوع پر میں مفصل بحث کروں گا۔

مسجد کا ذکر ختم کرنے سے پہلے یہ بیان کرنا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ عمارت پر اگرچہ نصرانی قبضہ ہے لیکن وہ اس کی نگہداشت اس توجہ سے کرتے ہیں کہ شاید کوئی اسلامی محکمۂ اوقاف بھی کرے۔ محراب کے گرد کٹھرہ لگا دیا ہے اور اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ تاکہ بیحرمتی نہ ہو۔ ہر اسلامی اثر کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ محرابوں کے تیغوں کو حالانکہ اس میں شیشوں کی یادگاریں موجود ہیں بتدریج کھودتے جارہے ہیں اور سلطنت کا یہ میلان ہے کہ گرجا کو اٹھا دیں۔ حضرات یہ تھوڑی بات نہیں ہے۔ دہلی کی جامع مسجد کا انتظام خود ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ چار پانچ سال ہوئے جب میں دہلی گیا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ انتظامی کمیٹی نے مسجد کے شمال غربی جانب کے چبوترے کو جہاں بہت سے قبور ہیں مٹی کے کونڈے بیچنے والوں

کو دیدیا ہے۔ ان بدمذاقوں نے وہاں کونڈوں مٹی اور کھاد کے ڈھیر لگا رکھے تھے جس سے قبور کی بیحرمتی کے علاوہ مسجد کی شان میں عجیب بے عنوانی پیدا ہو گئی تھی۔ اپنے ملک کے جہل اور تنگ نظری کا خیال کر کے مجھے اسلامی عمارات کے تحفظ کے متعلق ہسپانوی سلطنت کا طرز عمل Policy بہت پسند آیا۔

قرطبہ کی خوبیوں کے متعلق عربی اشعار جو میں نے شروع میں آپ کو سنائے تھے ان میں پل کا سب میں پہلے ذکر ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسجد سے قبل تعمیر ہوا تھا۔ عرب مورخین نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت سے قبل کوئی دو سو برس کا بنا ہوا یہاں ایک پل تھا۔ لیکن کمانیں سب گر چکی تھیں اور فقط پائے رہ گئے تھے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز (۷۲۵ تا ۷۱۷ء) کے زمانے میں جب السمح خولانی اندلس کے والی مقرر ہوئے۔ تو انھوں نے ۱۰۰ھ میں پل کو از سر نو بنوایا معمار (Architect) کا نام عبدالرحمٰن بن عبید الغافقی تھا۔ خلیفہ ہشام کے زمانہ میں پل کی تجدید ہوئی[۵۱] اور منصور نے ۳۷۶ھ میں اس کو مزید استحکام دیا۔ پل تقریباً ہزار فٹ لمبا ہے اور ۲۳ فٹ چوڑا ہے۔ اور تعمیر دریا سے بلندی تقریباً ۸۰ فٹ ہوگی لیکن عربی مورخین نے ۶۰ ذراع لکھی ہے۔ پل کی سولہ کمانیں اور سترہ پائے ہیں[۵۲]

پل کو بنے ہوئے بارہ سو برس کے قریب ہو گئے ہیں اس طویل مدت میں وادی الکبیر میں کیا کیا طغیانیاں اور سیلاب نہ آئے ہونگے لیکن پل پر مطلق اثر نہیں ہوا اور جوں کا توں قائم ہے اس استحکام کے لحاظ سے عربوں کے پل کو عجوبۂ روزگار بیان کرنا بیجا نہ تھا۔ پل کے آخری سرے پر ایک سنگین برج قلہرہ نامی اب تک قائم ہے شہر کی جانب کی رو کا رو ذرا خراب ہو گئی ہے لیکن پشت کی جانب جو مدور اور مربع پشتیبان نکلے ہوئے ہیں وہ اچھی حالت میں ہیں۔ پل کے نیچے اسی زمانہ کی چکیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں اب تک آٹا پستا ہے دریا کے دوسرے جانب سے شہر کا نظارہ دلفریب ہے شاہی قصر کی دیوار اور شکستہ برج اپنی خستہ حالی میں قرطبہ کی بربادی ایک عجیب پر اثر تصویر پیش کرتے ہیں۔

قصر میں آجکل مجلس ہے اور مہتمم صاحب مجلس کو جب خبر ہوئی کہ ایک مور (Moor) قرطبہ میں آیا ہوا ہے تو مجھ

---

[۵۱] خلیفہ ہشام کے متعلق قصہ مشہور ہے کہ جب وہ پل کی تجدید کر چکے تو کسی نے یہ کہدیا بادشاہ نے پل بنانے کے شوق کی خاطر بنایا تاکہ رفاہ عام کا خیال ان کو محرک نہیں ہوا تھا۔ یہ سنکر بادشاہ کو اس قدر رنج ہوا کہ پھر عمر بھر اس پل پر سے نہیں گزرے۔

[۵۲] نفح الطیب میں ۱۸ کمانیں اور ۱۹ پائے درج ہیں (صفحہ ۲۱۴ - جلد اول)

سے ہوٹل میں ملنے آئے اور کہا قصر کو چل کر دیکھیے۔ میں گیا دیکھا سوائے چند قدیم دیواروں زمینوں اور برجوں کے اب اصل عمارات میں سے کچھ باقی نہ رہا نفح الطیب میں ابن لبشکوال کی روایت سے قصر کی شان و شوکت کا ذکر موجود ہے. لکھا ہے قدیم رومیوں کا قصر بھی اسی مقام پر تھا اور ایسے نادر عجائبات اس زمانہ کے موجود تھے کہ انکی پوری تعریف بیان کرنی ناممکن ہے. خلفائے امیہ نے قصر کی زیب و زینت کو اور بڑھایا. پہاڑوں سے کاٹ کر آب شیرین کی نہریں لائے چشمے اور حوض بنائے. باغ لگائے اور محلات کو رونق دی کہ قصر جنت کا نمونہ بن گیا. محلات کے نام بھی درج ہیں. کسی کا نام حائر تھا کہ عقل اس کو دیکھکر دنگ ہوتی تھی. کسی کا نام سرور تھا کہ پژمردہ دلوں میں ترنگ پیدا کرتا تھا۔ اسی طرح کسی کا نام زاہر تھا اور کسی کا نام رشیق اور کسی کا نام مبارک اور کسی کا نام بدیع. بعض مورخین نے ان مکانات کی تعداد جو قصر میں تھے چار سو تیس لکھی ہے سنگ مرمر کے حوضوں میں سے پانی بہتا تھا اور سونے چاندی کی تلیوں میں سے فوارے چھٹے تھے۔

میں نے منصور بن ابی عامر کے محل کو بھی دیکھا ہے اس میں اب شفا خانہ ہے اور قدیم شان مطلق باقی نہیں بعض کنیساؤں اور دو کانوں میں کہیں کہیں عربی آثار نظر پڑ جاتے ہیں لیکن یہ اکثر طرز متاخر کے ہیں۔ ایک مکان میں البتہ جو سات سروالے مکان کے نام سے مشہور ہے برآمدے کے ستون صنعت کے لحاظ سے مدینۃ الزہرا کے ستونوں کے مماثل ہیں۔ [۱]

قرطبہ اب ایک چھوٹا سا دیہاتی قصبہ ہے آبادی پچاس ہزار کے قریب ہے کہاں وہ زمانہ کہ ایک لاکھ تیرہ ہزار مکانات صرف عام رعایا کے تھے. تین ہزار آٹھ سو ستر مسجدیں تھیں اور نو سو گیارہ حمام تھے اب سوائے ایک چوک کے جہاں ہوٹل ہیں باقی تنگ تنگ پتلی گلیاں ہیں شہر کی شمالی جانب کی نواح البتہ ذرا پرفضا ہے اور ایک سڑک جبل العروس کو چلی گئی ہے قدیم رصافہ یہیں ہوگا۔ پہاڑ کی سرسبزی کا کیا کہنا۔ کوسوں زیتون کے جنگل ہیں

---

[۱] قرطبہ کے عجائب خانہ میں رومانوی زمانہ کے چار مجسمے نہایت نفیس ہیں اس میں ایک علم کی دیوی منروا Minerva کا ہے اس کی افسوس ہے گردن ٹوٹ گئی ہے دوسرا ایک مردانہ سر ہے جس میں خد و خال نہایت خوبی سے دکھائے گئے ہیں غالباً کسی رومانوی بادشاہ یا شرار کی مورت ہے تیسرا بت زنانہ ہے اسکا بھی فقط سر ہی سر رہ گیا ہے. چوتھی تصویر نہایت قدیم معلوم ہوتی ہے اور اسمیں کوئی دیوتا الفوزے بجا رہا ہے قرطبہ میں مکانات کی بنیادیں کھودنے میں اکثر رومانوی آثار نکل آتے ہیں۔ ایک دوکان میں شراب رکھنے کے لئے تہ زمین ایک چوبچہ بنا ہوا تھا۔ اس کا فرش رومانوی زمانہ کی پچیکاری کا نہایت نفیس تھا۔

اور نارنگیوں کے تختوں نے پہاڑ کو گلزار بنا دیا ہے مجربیط کے شوقین امرا نے پہاڑ کے اوپر مکانات بنائے ہیں۔ میں جس ہوٹل میں اُترا ہوا تھا اس میں ایک امیر آکر اُترے۔ انھوں نے جبل العروس پر ایک نہایت نفیس آرام گاہ Plea-suante بنائی تھی۔ ہوٹل کا مالک اور قرطبہ کے بعض علم دوست اصحاب جن سے میری شناسائی ہوگئی تھی ان کے سر ہو گئے کہ مجھکو اپنا مکان دکھائیں۔ یہ بیچارہ اس لئے تامل کرتا تھا کہ مکان بہت دنوں سے بند پڑا تھا اور صفائی نہیں ہوئی تھی۔ آخر ہم سب گئے۔ مکان میں پیرس کے مذاق کے موافق پورا ساز و سامان موجود تھا۔ مجھے وہ بہت پسند نہیں آیا۔ البتہ چھت اور برآمدے سے جو طبعی منظر دیکھا وہ عجیب و غریب تھا۔ مقطع کا بند یہ ہوا کہ چونکہ ہم مکان کے خادموں کو بغیر اطلاع دیئے ہوئے پہنچ گئے تھے اس لئے وہاں نقل کا سامان کچھ نہ تھا۔ صاحب خانہ کو خاطر کرنی ضروری تھی اس لئے ان کے خمخانہ Cellar میں جو بہترین شراب تھی وہ منگوائی گئی میرے انکار پر ان کو تعجب ہوا۔ میں نے کہا آپ حیرت نہ کیجئے۔ میں اس ملک کا رہنے والا ہوں جہاں کے رہنے والوں کے متعلق بابر نے کہا ہے ؎

"عجب بدمذاق مردم ہستند چوں لب دریا
خیمہ زنند پشت خیمہ جانب دریا کنند"

پھر میں نے ان کو سارا قصہ سنایا جس سے وہ بہت محظوظ ہوئے۔

قرطبہ کے آثار میں اب صرف مدینۃ الزہرا کا حال بیان کرنا باقی ہے۔ اس کو میں عمارات کی اہمیت کے لحاظ سے ایک علیحدہ مضمون کی صورت میں پیش کرونگا۔

---

# منظور

ایک افسانہ از سید نصیر احمد بی۔ اے

دو منزلہ عمارت کے ایک وسیع اور بلند دروازے میں سے ایک آدمی نکلا اور دائیں جانب سڑک پر چلنے لگا۔ اس کی شکل و شباہت میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ متوسط قد، اونچے اونچے کاندھے، چوڑا چکلا سینہ۔ چہرے پر چھوٹی سی ڈاڑھی اور پتلی پتلی مونچھیں۔

البتہ اس کا لباس ضرور کچھ ایسا تھا کہ راہ چلتے ہوئے آدمیوں کو بھی خواہ مخواہ اپنی طرف متوجہ کرے۔ اس کو دیکھکر بہت سے لوگ راستے ہی میں کھڑے ہو جاتے اور اشاروں ہی اشاروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہتے ہوئے مسکرانے لگتے۔ یہ اس لئے کہ اسکی وضع قطع ـــــ جیسا کہ ہم نے ابھی عرض کیا ہے ـــــ عجیب تھی۔ چھوٹے کرتے پر ایک شیروانی نما کوٹ اور کوٹ کے نیچے کھلی موری کا پیجامہ، ٹخنوں سے اوپر سر پہ چوگوشیہ ٹوپی، پاؤں میں دہلی کا نرم و نازک جوتا اور ہاتھ میں چھڑی کی بجائے ایک لمبی سی قمچی۔

یہ ہیئت تھی اس شخص کی جسے لوگ منظور کہہ کر پکارتے تھے۔ شہر میں کوئی آدمی ایسا نہیں تھا جو اسے نہ جانتا ہو۔ یوں بھی منظور کی پیدائش اور تھوڑی بہت تعلیم اسی شہر میں ہوئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر بائیس تیئیس برس کے قریب تھی۔ قومی اور ملکی تحریکوں، سیاسی مظاہروں اور وطنی جمعیتوں سے اسے خاص دلچسپی تھی اور اسی دلچسپی میں اس نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ شہر کے سیاسی رہنما بھی تقریباً ہر بات میں اس سے کام لیتے۔ یہ ایک اور سبب تھا منظور کی شہرت کا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے وہ ایک مقامی تحریک میں "ڈکٹیٹر" کے فرائض انجام دے چکا تھا۔

لیکن اس وقت جب منظور نے بازار میں قدم رکھا ہے تو معلوم ہوتا تھا کہ اسے کوئی خاص بات پریشان کر رہی ہے اس لئے اس کی چال ڈھال اور وضع قطع سے "لیڈری" کی جو شان ہمیشہ ظاہر ہوا کرتی تھی اس کی بجائے اب خفگی اور غصے کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر ہوئی جب وہ دو منزلہ عمارت کے ایک کمرے میں گیا ہے تو منظور کی یہ کیفیت نہیں تھی۔ وہ نہایت خوش خوش زینے میں داخل ہوا اور بالائی منزل کے ایک کمرے میں جاتے ہی پوچھنے لگا۔ "کیا حضرت مولانا اندر ہیں؟"

ایک ادھیڑ عمر کے نوکر نے نہایت تعظیم کے ساتھ اسے بیٹھنے کے لئے کہا اور خود پاس ہی کے ایک دروازے میں سے حضرت مولانا کو اطلاع کرنے کے لئے اندر چلا گیا۔ کمرے میں ایک طرف چاندنی کا فرش تھا۔ دوسری جانب دو ایک تپائیاں اور متعدد کرسیاں رکھی تھیں۔ یہ غالباً اس لئے کہ مولانا کے ملاقاتیوں میں مشرقی اور مغربی ہر وضع کے لوگ شامل تھے۔ آتشدان پر دو چار گلدان، ایک بڑا سا آئینہ اور ایک چھوٹا سا ٹائم پیس رکھا تھا۔ منظور نے آگے بڑھکر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا شروع کیا۔ وہ اپنی شخصیت اور بلندی ذات کی دل ہی دل میں تعریف کر رہا تھا کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک پیرانہ سال بزرگ کمرے میں داخل ہوئے۔

السلام علیکم۔ میاں منظور۔ تم ہو؟ تم نے کہا تھا آئندہ کبھی میرے یہاں نہیں آؤ گے۔"

آداب عرض ہے مولانا۔" منظور نے کسیقدر خفت آمیز لہجے میں کہا... "مجھے آپ کو تکلیف دیتے ہوئے... میں شرمندہ ہوں کہ پھر حاضر ہو گیا مگر... قوم کی ہمدردی مجھے یہاں... آپکی خدمت میں لے آئی ہے۔" اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔

مولانا نے منظور کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے معصوم اور بزرگانہ چہرے پر صرف ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار تھی۔

منظور نے پھر کہا۔ "حضرت قبلہ۔ قوم کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔ عملی کام کرنے کی۔ آپ کی انجمن اور آپ کا نظام دنیا سے بہت پیچھے ہے...

"شاید ایسا ہی ہو۔" مولانا منظور کو ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارا کرتے ہوئے بولے۔

"دیکھو منظور!" انھوں نے کسیقدر خفگی کے ساتھ کہا۔

"جی قبلہ"

"میں نے تمکو کیا سمجھایا تھا؟"

"آپ نے مجھے کیا سمجھایا تھا؟ مولانا میں سچ عرض...."

"منظور تمہیں یاد ہے تمہارے والد نے تم کو کیا نصیحت کی تھی؟" کیا انھوں نے تم کو سمجھایا نہیں تھا کہ اول انسان کو صلاحیت پیدا کرنی چاہیے..."

"معاف کیجئے گا مولانا۔ آپ بزرگ ہیں۔ میں کچھ کہہ تو نہیں سکتا لیکن میں ان باتوں کو سنتے سنتے تنگ

آیا ہوں ...،، منظور کے لہجے سے اچھی خاصی بدتمیزی ظاہر ہو رہی تھی۔ مولٰسنا نے اسے ایک دفعہ پھر روک کر کہا۔ دیکھو میاں ہم لوگوں کو اپنے حال پر رہنے دو۔ میں نے تمہیں کیا سمجھایا تھا ابھی بچے ہو سیاسی معاملات کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔،،

سیاسی معاملات کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے،، منظور نے اپنے دل میں کہا۔ ،، اور یہ بڈھا جس کو نماز روزہ ہی سے فرصت نہیں ملتی اِن باتوں کو سمجھتا ہے۔،، منظور کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ مولانا سے اجازت لئے بغیر ہی کمرے سے نکل گیا۔ راستہ چلتے بھی مولانا ہی کی باتیں اس کے دل میں تھیں۔ ،، میں بچہ ہوں۔ معاملات کو نہیں سمجھتا ... کیا خوب اور یہ معاملات کیا ہیں ؟ نہ کام نہ کاج میں کہتا ہوں لوگوں میں عملی کام کرنے کی کس قدر ضرورت ہے۔ کیوں نہ میں ایک انجمن بنالوں ... مجھ میں کس بات کی کمی ہے۔ ملک کے سیاسی رہنما میری مدد کرینگے۔ ان کو معلوم ہو جائیگا کہ اس شہر میں بھی ایک کام کرنے والا آدمی موجود ہے ...،، اور یہ سوچتے سوچتے منظور کا دل اس تقریر کی طرف متوجہ ہو گیا جو ایک سیاسی رہنما نے ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے مقامی اسکول کے احاطے میں کی تھی۔،، اسکول اور کالج بیکار ہیں۔ قوم کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے ... پڑھنا لکھنا کوئی بہت بڑا کام نہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں نے کیا کالجوں میں تعلیم پائی تھی ؟ ... ہٹلر، مسولینی ...،، یوں بھی منظور کا خیال تھا کہ پڑھ لکھ کر آدمی کیا کرتا ہے ؟ کاروبار، نوکری، کوئی پیشہ مثلاً وکالت یا طبابت ... وغیرہ وغیرہ لیکن جو لوگ ایسا کرتے ہیں اُن کی عملی زندگی کیا ہے ؟ اُٹھنا بیٹھنا اور سو رہنا۔ قومی انجمنوں میں وہ حصہ نہیں لیتے۔ تقریریں وہ نہیں کرتے۔ مظاہروں کا انہیں شوق نہیں۔ یوں تماشائیوں کی طرح وہ سب باتوں کو دیکھتے ہیں لیکن خود ان میں کام کرنے کی ہمت نہیں۔ بہت دن ہوئے ایک مولوی صاحب نے اسے بتلایا تھا کہ انسان کو صرف عمل کی ضرورت ہے۔ علم و حکمت سب بیکار ہیں۔ شعر اور فلسفہ میں کیا رکھا ہے۔ اور سائنس سے تو آدمی صرف دنیا کا ہنر سیکھتا ہے اس کو عمل سے کیا تعلق ؟

یہ خیالات تھے جنکو لیکر منظور اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس نے مت ہوئی گھر سے الگ رہنا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ گھر کی زندگی اسے کچھ بہت زیادہ پسند نہیں تھی۔ ایک تو وہ اپنی والدہ کی یہ نصیحتیں سنتے سنتے تنگ آ گیا تھا کہ بیٹا کچھ پڑھ لکھ لو۔ پھر تمہیں اچھی سی نوکری ملجائے تو میں کس دھوم دھام سے تمہارا بیاہ رچاتی ہوں۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا جو روز دس بجے دفتر چلا جاتا تھا اور دفتر سے واپس آتا تو تھوڑی

بہت تفریح یا میل ملاقات کے بعد پڑھنے لکھنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اسے ہمیشہ اپنے بچوں اور معاش کی فکر رہتی تھی۔ منظور کہتا تھا یہ کیا لوگ ہیں۔ انکے اندر کوئی ولولہ نہیں۔ سونا۔ اُٹھنا۔ کھانا۔ پینا اور پھر سو رہنا بس یہ ہے انکی زندگی۔

ایک روز اس کے کسی دوست نے پوچھا۔ "تم نے پڑھنا لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟"

منظور نے کہا۔ "میں پڑھ لکھ کر کیا کرتا۔ یہی کہ کسی دفتر میں ملازم ہوتا۔ مگر ملازمت سے کیا ہوتا ہے۔ قوم کی خدمت کیونکر ہوتی؟

وہ ہر بات کے جواب میں یہی کہا کرتا تھا کہ قوم کی خدمت کیونکر ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے گھر کی بجائے ایک کرائے کا کمرہ اپنے رہنے کے لئے لے رکھا تھا۔ بینک میں اس کا تھوڑا سا روپیہ تھا۔ کچھ معاوضہ اسے قومی خدمت کا سیاسی انجمنوں سے ملجاتا تھا۔ یوں اس کی ضروریات زندگی پوری ہو جاتیں لیکن اس کے عجیب و غریب لباس اور دلچسپ شکل و شباہت کی طرح اس کی عادتیں بھی عجیب تھیں۔ وہ چارپائی کی بجائے ہمیشہ ایک تخت پر سویا کرتا تھا جس پر کھال کا فرش ہوتا۔ اس کے کمرے میں کھونٹیاں نہیں تھیں اس لئے کہ میدان جنگ میں کھونٹیاں نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کپڑے ہمیشہ کھڑکی یا کیواڑ کے پٹ پر لٹکایا کرتا تھا۔ اس کا کھانا اگرچہ مختصر ہوتا تھا لیکن اس کا کوئی وقت مقرر نہ تھا کیونکہ کام کرنے والے آدمی کبھی ان باتوں میں وقت کی پابندی نہیں کرتے۔ وہ جس شخص سے بات کرتا تھا بڑے وثوق اور تمکنت کے ساتھ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اثنائے گفتگو میں وہ دفعتہً کھل کھلا کر ہنسنے لگتا۔ یہ غالباً اس لئے کہ وہ اپنی باتوں پر غیر معمولی اعتماد رکھتا تھا لیکن اس وقت اس کی صورت کچھ ایسی مضحکہ خیز ہو جاتی تھی کہ جو شخص بھی اسے دیکھتا ہنسنے لگتا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود منظور ایک مخلص نوجوان تھا۔ وہ جو کام کرتا تھا صحیح اور درست سمجھکر کرتا تھا۔ تیرہ چودہ برس کی عمر ہی میں اس کے اندر ایک مبہم سا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی طبیعت انتظام و اہتمام اور آپس کے کاموں میں بہت لگتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہونے لگا کہ لوگوں میں شہرت اور نام آوری حاصل کرے اس خواہش میں اسے گھر، مدرسے یا مسجد میں جہاں کہیں موقعہ ملتا جا و بیجا ہر بات میں دخل دینا شروع کر دیتا۔ بعض دفعہ وہ بڑے ذوق و شوق سے اپنا سبق یاد کرتا اور بعض دفعہ سارا سارا دن کھیل کود میں گذار دیتا۔ اسکول کے معلمین جب اس کی باتوں کو سنتے تو ہنس دیتے

لیکن منظور کے دل میں ایک ہی خیال سمایا تھا اور وہ کوئی بہت بڑا کام کرنے کا۔ اتفاق سے انہی دنوں میں منتظمین مدرسہ کے خلاف چند لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بحث یہ تھی کہ انتظام ٹھیک نہیں۔ منظور نے اس تحریک کا دل سے خیر مقدم کیا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدول حکمی کی پاداش میں اس کا نام جماعت سے خارج کر دیا گیا۔

مدرسے سے نکل کر منظور نے شہر کی مختلف انجمنوں کا رخ کیا۔ شروع شروع میں تو کسی نے اسکی طرف توجہ نہیں کی لیکن کچھ دنوں کے بعد اس کے جوش اور مستعدی کو دیکھکر بعض انجمنوں نے اس سے کام لینا شروع کر دیا۔ بایں ہمہ منظور کی طبیعت کو قرار نہیں تھا۔ دو ایک انجمنوں کو اس نے بیکار سمجھکر چھوڑ دیا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ لوگ محض شہرت کے بھوکے ہیں۔ قوم کی خدمت سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ دو ایک انجمنوں نے اسے خود ہی بدتمیزی کی سزا میں نکال دیا۔ لیکن اس سے اتنا ضرور ہوا کہ شہر کے ہر جلسے اور ہر مظاہرے میں منظور کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

یہ گویا منظور کی زندگی کا نیا دور تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے جس چیز کی خواہش ہے ملگئی۔ بیشک بعض لوگ اس کو بُرا سمجھتے تھے مگر کام کرنے والوں کو کسی نے بُرا نہیں کہا؟ یہ بات اس نے ان سیاسی رہنماؤں کی زبان سے جو اکثر شہر میں آتے جاتے رہا کرتے تھے کئی مرتبہ سنی تھی یہی وجہ تھی کہ لوگوں کی لعنت ملامت کے باوجود منظور کو اپنی کسی غلطی کا احساس نہیں ہوا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ہر بات کیلئے صلاحیت شرط ہے۔ اور یہی سبق تھا جو اسے مولانا دیا کرتے تھے۔ یوں انھوں نے اس کا دل رکھنے کے لئے ——— اور کچھ اس خیال سے کہ شاید رفتہ رفتہ اس کی اصلاح ہو جائے ——— مجلس اسلامیہ میں جس کے وہ صدر تھے ایک معمولی کارندے کی جگہ دے رکھی تھی۔ مولانا خوب جانتے تھے کہ منظور ان آوارہ مزاج لڑکوں میں سے ہے جو بغیر کسی ہنر یا قابلیت کے شہرت حاصل کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ ان کا دل ہنگامو نکی طرف کھنچتا ہے۔ محنت اور تربیت سے وہ دور بھاگتے ہیں۔ مولانا اکثر سوچا کرتے تھے کہ جو لوگ آئے دن کے شور و شر کی نذر ہو جاتے ہیں ان کا انجام کیا ہوگا۔ وہ ہمیشہ قوم کے رہنماؤں سے اس امر کی شکایت کرتے رہتے تھے کہ ان کا افراد میں سیرت کی بجائے محض سیاسیات کا شوق پیدا کرنا گویا آگ سے کھیلنا ہے۔ قوم کو عمل کے ساتھ ساتھ فکر و متانت اور پختہ کرداری کی ضرورت ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تمہاری ہنگامہ پروری جذبات کی نمائش کیلئے تو بہت موزوں ہے لیکن اس کا نتیجہ معلوم۔

یہ نہیں کہ مولانا سیاسیات کے مخالف ہوں۔ خود ان کی ساری زندگی انہی باتوں میں گذرتی تھی۔

اس وقت بھی وہ مجلس اسلامیہ کے صدر تھے اور اس مجلس نے شہر کے مسلمانوں میں ملک کی سیاست معیشت اور اپنے اجتماعی اور دینی مسائل کے متعلق ایک ایسا بلند اور صحیح طرز عمل پیدا کر دیا تھا جس کی ہر شخص تعریف کرتا تھا۔ مولانا کی شہرت دور دور کے مقامات میں پہنچ گئی تھی اور اہل بصیرت کا خیال تھا کہ اگر ان کی جماعت ملک میں ہر جگہ پھیل گئی تو اس سے بڑے شاندار نتائج مترتب ہونگے۔

لیکن نوجوان طبقہ بالعموم مولانا کا مخالف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جو کچھ کرنا ہے فوراً کیا جائے اور ارد گرد کے شہرت پسند لیڈر انہیں اس بات پر اکساتے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ منظور کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ مولانا کی طبیعت پر احتیاط کی بجائے خوف کا غلبہ ہے وہ کئی دفعہ انکی خدمت میں حاضر ہوا اور ہر مرتبہ بہادرانہ اقدام کا مطالبہ کیا۔ مولانا اس کو لاکھ سمجھاتے لیکن منظور ایک ضدی لڑکے کی طرح اپنی بات پر اڑا رہا آخر کئی مہینے کی مسلسل ردوکد کے بعد ایک دن وہ غضبناک ہو کر جیسا کہ ہم نے شروع میں بیان کیا تھا مولانا کے ہاں سے چلا آیا۔

---

چھ مہینے گذر گئے اور اب منظور ایک نئی انجمن کا صدر ہے۔ چونکہ اسے مولانا کا مقابلہ مدنظر ہے اس لئے اس نئی انجمن کا نام بھی "مجلس ملیہ اسلامیہ" تجویز کیا گیا ہے۔ وہ کہتا تھا ہمیں مساجد کی تنظیم اور یتیم خانوں کی اصلاح کی طرف قدم اٹھانا ہے۔ غریبوں اور بیواؤں کی مدد کرنا ہے۔ مسلمانوں کی معاشی حالت ٹھیک نہیں ان کو ملی صنعتوں میں حصہ لینا چاہیے۔ غیر ملکی اشیاء کا استعمال گویا قوم سے غداری کرنا ہے۔ وہ بہادروں کی طرح ہر بات میں آگے آگے رہیں گے۔ اپنی پہلی تقریر میں اس نے کہا۔

بھائیو! ہم خادمان ملک و ملت پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہمیں آزادی حاصل کرنی ہے۔ قوم کے دشمنوں سے لڑنا ہے۔ غداران وطن کو بے نقاب کرنا ہے ... بھائیو ہمارا کوئی ذاتی مقصد نہیں۔ ہم سچے دل سے قوم کے ہمدرد ہیں ہماری مجلس میں شریک ہو جاؤ۔ یہ بے غرض لوگوں کی جماعت تمہاری اور ملک و قوم کی عزت کے لئے قائم کی گئی ہے۔

لیکن ان خادمان ملک و ملت کی حالت یہ تھی کہ جب تک ایک سیاسی تحریک کا دور دورہ رہا انکے جلسے اور مظاہرے بہت زور شور سے ہوتے رہے لیکن تھوڑے دنوں کے بعد جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو ان کے لئے کوئی کام نہ تھا۔ مساجد کی تنظیم اور مذہب کے ٹھیکیداروں کو نماز روزے سے تو کوئی مطلب تھا نہیں۔ وہ غریبوں کی

ہمدردی کا وعظ کہتے لیکن خود زکوٰۃ یا صدقے پر ایک پیسہ بھی صرف نہ کرتے۔ پڑھنا لکھنا تو ان کے نزدیک ایک بیکار سی چیز تھا۔ اس کو عمل سے کیا تعلق۔ رہی صنعت و حرفت یا کاروبار سو جب تک ملک آزاد نہ ہو جاتا اس سے فائدہ؟ یہ لوگ دن بھر شہر سے باہر ایک چوپال میں پڑے رہتے اور تاش، شطرنج یا ادھر ادھر کی گپ ہانکنے میں اپنا وقت گذارتے۔ رفتہ رفتہ اہل شہر نے محسوس کرنا شروع کیا کہ ان میں ایک نہایت تکلیف دہ عنصر پیدا ہو گیا ہے جو صرف شور و شر کا دلدادہ ہے۔ قوم کی سچی ہمدردی یا ملک کی صحیح خدمت سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ لوگ کہتے تھے کہ جن لوگوں نے تعلیم حاصل نہیں کی۔ جن کی عقل اور فکر نہایت محدود ہے۔ جو گھر بار کی معمولی ضروریات اور عام انسانی اخلاق سے بے خبر ہیں وہ قوم کی خدمت کیا کریں گے۔ کیا ان لوگوں نے شرفا پر آوازے نہیں کسے، شہر کی مفید انجمنوں کو برا بھلا نہیں کہا۔ ایک مولوی صاحب کی محض اس لئے بے عزتی کی کہ انھوں نے کھدر نہیں پہنا تھا۔ یہ لوگ اکثر مولٰسنا کے ہاں جاتے اور "مجلس ملیہ اسلامیہ" کی مفسدہ پردازیوں کی شکایت کرتے لیکن مولٰسنا ہر ایک سے یہی کہتے۔ بھائی تم کو دوسروں سے کیا مطلب۔ اپنا کام کئے جاؤ۔

آخر وہ وقت بھی آ گیا جب اس خود ساختہ مجلس ملیہ کا سارا بھرم کھل جاتا۔ شہر کے دو چار با اثر آدمیوں نے اس کے بعض کارندوں کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ دو چار اپنی بدزبانی کی سزا میں پٹ گئے اور دو چار کا پولیس نے بعض شبہات کی بنا پر چالان کر دیا۔ ایک صاحب چندے کی صندوقچی پر قبضہ کر بیٹھے۔ منظور کو یہ سب باتیں معلوم ہوئیں تو غضبناک ہو گیا۔ اس نے تمام ارکین مجلس کو چوپال میں جمع کیا اور انہیں لعنت ملامت کرنا شروع کی لیکن ابھی اس کے منہ سے دو چار لفظ نکلے ہی تھے کہ ایک شخص نے زور سے اس کے سر پر گھونسہ رسید کیا۔ اب جو منظور کو ہوش آیا ہے تو وہ ایک ہسپتال میں پڑا تھا۔ ایک طرف اس کی والدہ بیٹھی تھی اور دوسری جانب بھائی۔ ایک ایک کر کے پچھلے سب واقعات منظور کی آنکھوں سے گذر گئے۔

---

اب آپ منظور کو ہر روز صبح ایک کارخانے میں جاتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ اس نے باہر کی رہائش ترک کر کے اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ رہنا شروع کر دیا ہے۔ اس کی عادتیں بھی بدل گئی ہیں۔ اب نہ وہ لباس ہے نہ کج بحثی۔ وہ کہتا ہے وقت کا ضائع کرنا اور تعلیم و تربیت سے غفلت ایک بہت بڑا جرم ہے۔ اپنے دوستوں اور بزرگوں کے سامنے اس نے کئی مرتبہ اس بات کا اقرار کیا ہے کہ دنیا میں ہر کام کے لئے صلاحیت شرط ہے۔

سُنا ہے حضرت مولانا بھی منظور کے متعلق اپنا فیصلہ بدل چکے ہیں اور انھوں نے مجلس اسلامیہ میں پھر اسے ایک چھوٹا سا عہدہ دے دیا ہے۔

# تنقید و تبصرہ

## ا۔ صحیح بخاری

انگریزی ترجمہ معہ حواشی از الحاج محمد اسد

قارئین طلوع اسلام غالباً مشہور آسٹری نو مسلم جناب محمد اسد صاحب (لیوپولڈ وائس) سے ناواقف نہیں ہونگے۔ دو برس ہوئے جب انھوں نے اسلام پر اپنی پہلی تصنیف Islam At The Crossroads شائع کی ہے تو ملت کے ہر طبقے نے دلی مسرت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ اب محمد اسد صاحب نے صحیح بخاری کے انگریزی ترجمے کی ابتدا کر دی ہے۔ یہ کام جس قدر اہم ہے اور اس کے لئے جس قدر محنت اور روپے کی ضرورت ہے اس کے متعلق کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مسلمانان ہند اس عظیم الشان دینی خدمت میں جس کو مترجم نے تن تنہا اپنے ذمے لیا ہے اکا ہاتھ بٹائینگے۔

صحیح بخاری کا مکمل ترجمہ غالباً چار ہزار صفحات پر مشتمل ہوگا۔ جس کو مترجم نے ۱۲۰ صفحات کے ۳۰ حصوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے ہر حصے کی قیمت عہ ہوگی (محصول ڈاک اس کے علاوہ ہے) جو کام کی اہمیت اور ترجمے کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی زیادہ نہیں۔

اسوقت تک پہلا حصہ طبع ہو چکا ہے جسمیں صرف دو باب یعنی کتاب الوحی اور کتاب الایمان کا ترجمہ عربی متن کے ساتھ نہایت اعلیٰ درجے کے ٹائپ میں دیا گیا ہے۔ یہ حصہ اگرچہ تمہیدی ہے مگر اس کے باوجود ۸۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ جا بجا تشریحی نوٹ موجود ہیں جس سے ترجمے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ فاضل مترجم کا ارادہ پوری کتاب کو اس قسم کے ٹائپ میں شائع کرنے کا ہے جس سے اصوات کا پتہ چل سکے گویا پہلا حصہ شائقین کو اس ٹائپ میں مفت ملیگا۔ علاوہ ازیں ہر پانچ چھ حصوں کے بعد خریداروں کو ایک خوشنما جلد بھی روانہ کر دی جائیگی جس میں وہ متعدد حصے رکھ سکتے ہیں ملنے کا پتہ

Arafat Publications, Srinagar (Kmr). یا

مہتمم مجلہ طلوع اسلام قرول باغ۔ نئی دہلی

## ۲۔ نقش چغتائی

قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور

خان بہادر محمد عبدالرحمن چغتائی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ ان کی مصوری کا شہرہ ہندوستان سے نکل کر اب یورپ اور امریکہ میں پہنچ چکا ہے۔ جس کسی نے چغتائی کی تصویریں دیکھی ہیں وہ انکے ذوق جمال کا قائل ہوگیا ہے مرزا غالب سے انھیں خاص عقیدت ہے اور عقیدتمندی کا یہی جذبہ تھا جس نے ان کو مرقع غالب کی طیاری پر آمادہ کیا نقش چغتائی غالب کے اکثر اشعار کو مصور شکل میں پیش کرنے کے لئے انکی دوسری کوشش ہے اور لہذا پہلی سے بہتر۔ یہ بات اگرچہ اہل نظر مشکل سے تسلیم کرینگے کہ چغتائی صاحب کی بنائی ہوئی تصاویر میں فی الواقع غالب کے اشعار اپنے صحیح معنوں میں نمایاں ہو جاتے ہیں بایں ہمہ اس دوسرے مجموعے کی تصاویر باوجود ان مغربی اثرات کے جو غالباً سفر یورپ سے چغتائی پر مترتب ہوئے۔ پہلے مجموعے یعنی مرقع غالب سے کہیں بہتر ہیں۔ کتاب کی باقی خوبیوں کے متعلق کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ اعلیٰ درجہ کی کتابت و طباعت، خوشنما اور مرجانیوالی جلد، نفیس بادامی کاغذ ان سب خوبیوں کے مقابلے میں قیمت کچھ بھی زیادہ نہیں۔

---

**حقیقت اسلام** ۔ پیکو لمیٹڈ، بیرون موچی دروازہ لاہور کا ماہوار دینی رسالہ زیر ادارت سید محمد شاہ صاحب، ضخامت ۵۶ صفحات، قیمت سالانہ دو روپے۔

پیکو لمیٹڈ نے جہاں اپنی بے نظیر طباعت اور قرآن پاک کی اشاعت سے ہندوستان میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی ہے وہاں ایک نہایت سنجیدہ اور متین مذہبی اور اصلاحی رسالہ بھی شائع کر رکھا ہے۔ حقیقت اسلام کے جس قدر پرچے ہماری نظر سے گذرے ان کو دینی معلومات سے لبریز پایا۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا مضمون مجدد کی شناخت خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

**ندیم** ۔ صوبہ بہار کا ادبی رسالہ، حجم ۷۰ صفحات، چندہ سالانہ چار روپے ہیں۔ یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ رسالہ ندیم نہایت کامیابی کے ساتھ اب اردو کی خدمت میں مصروف ہے اور اس نے عام بازاری روش سے ہٹکر اعتدال اور حسن مذاق کو اپنا رہنما بنایا ہے مضامین کی ترتیب اور رسائل کے انتخاب سے پتہ چلتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب ندیم کو اردو کی خدمت مقصود ہے۔ ملنے کا پتہ منیجر رسالہ ندیم۔ گیا (بہار)

عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ

# طلوعِ اسلام

ایک ملّی اسلامی مجلّہ

زیرِ ادارت
سیّد نذیر نیازی،


| جلد۔ ۱ | ضمیمہ اشاعت مارچ ۱۹۳۶ء | عدد۔ ۳ |
|---|---|---|


## اسلام اور احمدیّت

جس میں

پنڈت جواہر لال نہرو کے تمام استفسارات کا جواب موجود ہے

از رشحاتِ قلم

ترجمانِ حقیقت حضرت علامّہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلّہ العالی

اسلام اور احمدیت میں علامہ موصوف کی ان تحریروں کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے جو تحریکِ احمدیت کے متعلق وقتاً فوقتاً شائع ہوتی ہیں

# طلوع اسلام کے متعلق معاصرین کی رائیں

**روزنامہ احسان** ـــــ طلوع اسلام جیسے بلند پایہ علمی اور اجتماعی مجلہ کی اشاعت ایک حیرت انگیز واقعہ ہے... اہل ذوق کو ملک کے ہر گوشے سے طلوع اسلام کی اعانت کے لئے بڑھنا چاہئے کیونکہ اس صحیفہ نے ایک اہم قومی ضرورت پوری کر دی ہے اور اپنے مطالب اور زبان و بیان کے اعتبار سے اسے ملک میں یگانہ اور منفرد خصوصیت حاصل ہے۔

**صدق لکھنؤ** ـــــ ایک بڑی ضرورت باقی تھی اس قسم کے رسالے کی، جو دور حاضرہ کی علمی سیاسی، تمدنی، تمام تحریکات کو اسلامی نظر سے دیکھتا ہو اپنی، اسلامیت کے اعلان میں شرم نہ محسوس کرتا دلی مسرت کا مقام ہے کہ دہلی سے طلوع اسلام انھیں مقاصد و عزائم کو لے کر طلوع ہوا ہے۔ انگریزی میں جسے اسلامیک کلچر کہتے ہیں اس کی ترجمانی کا حق اس رسالے نے ادا کر دیا ہے۔ اللہ ایسے ہونہار پرچے کو استقامت نصیب کرے اور کامیاب سے کامیاب تر کرے۔

**معارف اعظم گڈھ** ـــــ ایک ملی و اسلامی رسالہ ہے جس میں قابل قدر مضامین و مباحث پیش کئے گئے ہیں اس کا مقصود مسلمانوں کو اسلامی نصب العین اختیار کرنے کی دعوت دینا ہے یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ مسئلہ ختم نبوت بھی جو در اصل موجودہ ہندوستان میں جدید علم کلام کا ایک اہم مسئلہ ہے اسکی توجیہ کا خاص مرکز ہے چنانچہ اس موضوع پر ایک سے زیادہ متین اور سنجیدہ مضامین چھاپے گئے ہیں اس عزیز معاصر سے مجموعی حیثیت سے ہندوستانی زبان میں ایک قابل قدر اسلامی رسالہ کا اضافہ ہوا ہے۔ جس کا ہم پرجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔

**حمایت اسلام لاہور** ـــــ طلوع اسلام، دہلی، اسلامی آسمان صحافت کا سب سے نو طلوع لیکن سب سے زیادہ تابناک ستارہ ہے۔ کیا عجب کہ یہ جدید دنیائے اسلام کے صبح کا ستارہ ہو جائے... اس کا نصب العین دنیائے حاضر میں ملت اسلامیہ کی حیات قومی اور پیام کی تفسیر کرنا اور مسلمانوں کے انفرادی و اجتماعی شئون پر بحث و نظر کا باب کھولنا ہے۔ بالفاظ دیگر طلوع اسلام۔ ملت اسلامیہ کا پیامبر اور مفسر ہے.. مسلمانوں کی کسی ریڈنگ روم، لائبریری، کتب خانہ اسکول، انجمن، ادبی سوسائٹی، تفریحی کلب۔ مذہبی و قومی ادارہ کو۔ طلوع اسلام کی روشنی سے محروم نہیں رکھنا چاہئے۔ ہم علی الخصوص انجمن حمایت اسلام لاہور سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس عالی پایہ مجلہ اسلامی کو انجمن کے تمام اسکولوں کالجوں

# اسلام اور احمدیت

مجھے اکثر مسلمانوں کی طرف سے جن کے سیاسی اور دینی خیالات میں بہت کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے اُن تینوں مضامین کے متعلق جو ماڈرن ریویو کلکتہ میں شائع ہوئے متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں ان حضرات کا تقاضا ہے کہ مسلمانانِ ہند نے احمدیوں کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے اُس کی مزید توضیح و تشریح کے علاوہ یہ بھی تبلایا جائے کہ وہ اس میں کہاں تک حق بجانب ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ دریافت کیا ہے کہ احمدیت کی بحث میں دراصل کونسا مسئلہ ہمارے سامنے آگیا ہے۔ لہٰذا اس تحریر سے اوّل اُن مطالبات کا پورا کرنا مقصود ہے جو میرے نزدیک سراسر بجا ہیں۔ اس کے بعد مجھے پنڈت جواہر لال نہرو کے استفسارات کا جواب عرض کرنا ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ میرے بیان کے بعض حصوں سے شاید پنڈت جی کو مطلق دلچسپی نہیں ہوگی انکو چاہیے کہ دورانِ مطالعہ میں اُن حصوں سے یونہی سرسری طور پر گذر جائیں۔

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پنڈت جی کا ایک ایسے مسئلے سے دلچسپی کا اظہار کرنا جو میرے نزدیک مشرق بلکہ تمام دنیا بھر کے اہم ترین مسائل میں سے ہے ہمارے لئے دلی مسرت کا باعث ہے۔ میری رائے میں وہ پہلے ہندوستانی نیشنلسٹ رہنما ہیں جنہوں نے اس روحانی اضطراب اور بے چینی کو سمجھنے کی خواہش ظاہر کی ہے جو اسوقت عالم اسلام میں رونما ہے۔ چونکہ یہ اضطراب مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا اور اس کے ردِعمل کی کئی ایک صورتیں ہیں لہٰذا ہندوستان کے ہوشمند سیاسی رہنماؤں کا فرض ہے کہ جن مسائل نے بحالت موجودہ مسلمانوں کے اندر ایک ہیجان پیدا کر رکھا ہے اس کی صحیح نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے خود پنڈت جی اور ان تمام حضرات سے جو اس تحریر کا مطالعہ کریں گے یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ پنڈت جی کے مضامین کو دیکھ کر جو مختلف احساسات میرے

دِل میں رُونما ہوئے اُن سے تھوڑی دیر کے لئے مجھے بے حد رنج ہوا۔ پنڈت جی ایک ایسے انسان ہیں جنکا دِل مختلف تہذیبوں کی قدر دانی سے خالی نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے سوالات فی الواقع خلوص نیت پر مبنی ہیں۔ بایں ہمہ انھوں نے اس کے لئے جو طریقہ اختیار کیا اس سے ایک ایسی ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے جسکی اُن سے توقع نہ تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قادیانیت کے متعلق میں نے جو بیان دیا تھا۔ اور جس میں صرف ایک مذہبی عقیدے کو جدید خیالات کی روشنی میں پیش کیا گیا۔ اس سے قادیانی اور پنڈت جی دونوں پریشان ہیں اور یہ اس لئے کہ اندرونی طور پر غالباً نہ پنڈت جی یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے اندر کوئی سیاسی اور دینی استحکام پیدا ہو سکے نہ قادیانی گو اس کے لئے دونوں کی وجوہ الگ الگ ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہندوستانی وطن پرست اپنے تخیل [redacted] اس طرح غرق ہیں کہ انھیں حقائق کا احساس ہی باقی نہیں رہا اور وہ کسی حالت میں یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ہندوستان کے شمال مغربی اقطاع میں مسلمانوں کے اندر سیاسی اعتبار سے خود مختاری کا جذبہ پیدا ہو۔ میرے خیال میں ان کی یہ رائے سراسر غلط ہے کہ ہندوستان کی تحریک وطنیت صرف اس شکل میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ اس ملک کی مختلف تہذیبوں کے جداگانہ وجود کو بالکل مٹا دیا جائے حالانکہ ہندوستان میں ایک متنوع اور پائیدار تہذیب کے ارتقا کا اگر کوئی امکان ہے تو صرف اُن (تہذیبوں) کی بدولت پنڈت جی کے ذہن میں وطنیت کا جو تخیل ہے اُس کا نتیجہ سوائے آپس کی شکر رنجی اور ایک دوسرے پر تشدد کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ علیٰ ہذا قادیانی حضرات بھی مسلمانانِ ہند کی بیداری سے خائف ہیں کیونکہ اگر ہم مسلمانوں کو فی الواقع کوئی سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تو ان کی یہ آرزو کیونکر پوری ہو سکتی ہے۔ کہ پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت سے ایک ہندی پیغمبر کی اُمت تیار کریں لہذا یہ کسقدر عجیب بات ہے کہ میری اس کوشش کو دیکھتے ہوئے کہ ہندوستان کے مسلمان سیاسیات کے جس نازک دور سے گذر رہے ہیں اس میں خصوصیت کیساتھ اپنے اندرونی استحکام کیطرف متوجہ ہوں اور علیٰ ہذا ان تفرقہ خیز تحریکوں سے محترز رہیں جنہوں نے بظاہر اصلاح کا جامہ پہن رکھا ہے پنڈت جی کو اس امر کا موقعہ مل گیا ہے کہ وہ ان تحریکات سے ہمدردی کا اظہار کریں۔

بہرکیف مجھے اس ناخوشگوار بحث کو زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں کہ اگر پنڈت جی نے ایسا کیا تو کن محرکات کے زیر اثر؟ میں ان حضرات کے فائدے کے لئے جو قادیانیوں کے متعلق مسلمانوں کی عام روش کو سمجھنا چاہتے ہیں ڈیورنٹ کی تصنیف "داستان فلسفہ" کی ایک عبارت کی طرف اشارہ کرونگا

جس سے امید ہے یہ مسئلہ صاف ہو جائے گا کہ قادیانیت سے دراصل ہمارا صحیح نزاع کیا ہے۔ ڈیورنٹ نے بہت تھوڑے الفاظ میں اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ یہود نے اشپینوزا ایسے عظیم فلسفی کو اپنی برادری سے کیوں خارج کر دیا تھا۔ بایں ہمہ قارئین کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ڈیورنٹ کے اقتباس سے راقم الحروف کا مطلب بانیٔ احمدیت اور اشپینوزا کا باہم مقابلہ کرنا ہے "دو خداست" اشپینوزا کے ذہن میں تو کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ اسکا وجود ایک نئی جماعت کا مرکز ہے۔ اور اگر کوئی یہودی اس کا انکار کرتا ہو یا اس کی جماعت میں شامل نہیں تو وہ گویا یہودیت سے خارج ہے۔ لہذا ڈیورنٹ کے اس اقتباس سے یہود کی اس روش کی نسبت جو انہوں نے اشپینوزا کے متعلق اختیار کر رکھی تھی مسلمانوں کے اس طرزِ عمل کی کہیں زیادہ صراحت ہو جاتی ہے۔ جس کا تعلق قادیانیوں سے ہے۔ ڈیورنٹ کی عبارت حسب ذیل ہے۔

بزرگان یہود کا خیال تھا کہ امسٹرڈم میں انکی جو مختصر سی جماعت موجود ہے اسکو تفرقہ و انتشار سے محفوظ رکھنے کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو صرف وحدت دین اس لئے کہ بغیر اس وحدت کے نہ ان میں اتحاد و اتفاق ہی رہ سکتا تھا نہ یہ ممکن تھا کہ یہود کی بکھری ہوئی جماعت دنیا میں باقی رہے۔ اگر ان کی کوئی حکومت، کوئی ملکی قانون اور دنیوی قوت کے کچھ ادارات ہوتے تو وہ اپنے داخلی استحکام کے ساتھ ساتھ دوسروں کی نظر میں اپنا وقار قائم رکھ سکتے تھے۔ ان حالات میں ممکن ہو وہ زیادہ روادار بھی ہوتے لیکن ان کے لئے مذہب ایمان اور حب الوطنی دونوں کا مرادف تھا۔ وہ ہیکل کو مذہبی عبادات و رسوم کے علاوہ اپنی سیاسی اور اجتماعی زندگی کا مرکز سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک کتاب مقدس گویا انکا دو منقول آبائی وطن۔ لہذا وہ الحاد کو غدر اور رواداری کو خودکشی سے تعبیر کرتے تھے۔

چونکہ کی یہود کی حیثیت مسٹرڈم میں ایک اقلیت کی تھی لہذا ان کا اشپینوزا کے وجود کو تفریق و انتشار کا باعث قرار دیتے ہوئے یہ سمجھنا کہ اس طرح ان کی جمعیت بکھر جائے گی سراسر حق بجانب تھا علی ہذا ہندی مسلمانوں کا یہ خیال کہ قادیانی تحریک جس کے نزدیک تمام مسلمان کافر ہیں اشپینوزا کی مابعد الطبیعیات کی نسبت جس سے یہود کا اتحاد خطرہ میں تھا اسلام کیلئے کہیں زیادہ مضر ثابت ہوئی ہے کلیتہً صحیح ہے میری رائے میں ہندوستانی مسلمان اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں کی نسبت فطرتاً ان قوتوں کا کا زیادہ احساس رکھتے ہیں جو ان کی وحدت ملی میں حائل ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جمہور اسلام کی یہ بصیرت جو گویا انھیں جبلتاً عطا ہوئی ہے ہندی مسلمانوں کے اندر کہیں زیادہ گہری ہے۔ جو لوگ ان معاملات میں رواداری کا نام لیتے ہیں وہ اس لفظ کے استعمال میں نہایت بے احتیاط واقع ہوئے ہیں اور شاید اسکا مطلب بھی نہیں سمجھتے

اس لئے کہ رواداری ذہن کی مختلف کیفیات سے مترتب ہوتی ہے۔ بالفاظ گبن ایک روادار فلسفی کی یہ وہ سمجھتا ہو کہ دنیا کا ہر مذہب سچا ہو۔ دوسری سورخ کی کیونکہ اسکے نزدیک تمام مذاہب جھوٹے ہیں اور تیسری اہل سیاست کی اسلئے کہ انکے نزدیک کوئی مذہب فائدے سے خالی نہیں پھر ایک روادار اس شخص کی ہو جو ہر طرز خیال اور ہر اسلوب عمل کو برداشت کر سکتا ہو اس لئے کہ خود اسکا کوئی طرز خیال ہو نہ اسلوب عمل۔ کمزور آدمی بھی بہت روادار ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ڈر اور بزدلی کے ہاتھوں ہر قسم کی ذلتیں گوارا کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رواداری کی یہ مختلف شکلیں اخلاقی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں برعکس اس کے جو شخص ایسا کرتا ہے وہ روحانی اعتبار سے مرچکا ہے۔ صحیح رواداری وسعت علم اور روحانی ترقی سے مترتب ہوتی ہے۔ یہ اس شخص کی رواداری ہے جو روحانی اعتبار سے مستحکم و مضبوط ہے کہ اپنے دین و ایمان کیلئے غیرت اور حمیت رکھتے ہوئے دوسروں کے اعتقادات کو عدم تعصب بلکہ قدر دانی کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اس قسم کی رواداری کا صرف ایک مسلمان ہی اہل ہو سکتا ہو اس کا اپنا دین امتزاجی ہے یعنی اسمیں تمام اجزائے حیات کا امتزاج پایا جاتا ہو۔ لہذا اس کے لئے دوسرے مذاہب کی ہمدردی یا قدر دانی ایک آسان سی بات ہے۔ ہمارے جلیل القدر ہندی شاعر امیر خسرو نے اس قسم کی رواداری کو ایک بت پرست کے قصہ میں کس خوبی کیساتھ بیان کیا ہے یہ لکھنے کے بعد کہ اس شخص کو بتوں سے کس قدر عقیدت تھی خسرو نے مسلمانوں کو اس طرح مخاطب کیا ہے ؎

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری
ہم زوے آموز پرستش گری

یہ صلاحیت صرف انہی لوگوں میں پائی جاتی ہے جو ذات الٰہی سے حقیقی عشق رکھتے ہیں کہ وہ دوسروں کی عقیدت و پرستش کو خواہ اس کا تعلق غیر اللہ سے کیوں نہ ہو قدر دانی کی نگاہوں سے دیکھ سکیں۔ اس وقت ہمیں جو لوگ رواداری کا سبق دے رہے ہیں وہ نادانی سے یہ نہیں سمجھتے کہ کسی شخص کا اپنے دین کے لئے غیرت و حمیت رکھنا تعصب میں داخل نہیں اور اگر وہ اس کو پست اخلاق پر مبنی سمجھیں تو یہ ان کی غلطی ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ جس طرز عمل کی وہ مذمت کرتے ہیں۔ دراصل زندگی کی علامت ہے۔ اگر کوئی جماعت محض اپنی طبیعت یا کسی عقلی دلیل کی بنا پر یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کا اجتماعی وجود خطرے میں ہو تو اس امر کا دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا ان کا مدافعانہ رویہ اصول حیات کے مطابق ہو یا نہیں؟ گویا اس معاملہ میں افکار و اعمال کی پرکھ اس بنا پر کیجائے گی کہ وہ کہاں تک بقائے ملی میں مساعد ہیں۔ لہذا اس مسئلہ میں بحث یہ نہیں ہے کہ ایک ایسے شخص کے

متعلق جسکو ملحد قرار دیا گیا ہو کسی فرد یا جماعت کا طرز عمل اخلاقی لحاظ سے مذموم ہو یا مستحسن۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہ طرز عمل زندگی بخش ہو یا زندگی کا منافی معلوم ہوتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی رائے میں ہر ایسی جماعت کیلئے جسکی اساس مذہب پر ہے "احتسابی عدالت" Inquisition کا قیام ضروری ہے۔ عیسائیت کی تاریخ میں بیشک ایسا ہی ہوا لیکن اسلام نے تو پنڈت جی کی منطق کے باوجود تیرہ سو سال سے اس قسم کا کوئی ادارہ قائم نہیں کیا۔ قرآن پاک میں صاف صریح طور پر اسکی ممانعت کردی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "دوسروں کے عیوب کا تجسس نہ کرو اور نہ اپنے بھائیوں کی چغلی کھاؤ"۔ اگر پنڈت جی تاریخ اسلام کا مطالعہ کریں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ جو یہودی یا عیسائی مذہبی تشدد سے تنگ آ جاتے تھے ان کو ہمیشہ بلاد اسلامیہ میں پناہ ملتی تھی۔ اسلام نے اصولی طور پر اپنی عمارت کی بنا جن دو قضایا پر رکھی ہے اس قدر سادہ اور آسان ہیں کہ اس میں کسی ایسے الحاد کا جس سے اس کا مرتکب کافر ہو جائے بہت کم امکان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی ملحد اسلام کے نظام اجتماعی کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ایک خود مختار اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ اس سے باز پرس کرے لیکن ان مواقع پر اس کا ایسا کرنا سیاسی مصلحتوں کا نتیجہ ہوگا نہ کہ دین کا۔ میں اس امر کو خوب محسوس کرتا ہوں کہ پنڈت جی کا تعلق باعتبار پیدائش اور تعلیم و تربیت ایک ایسی جماعت سے ہے جسکے کوئی حدود معین نہیں لہذا اس میں اندرونی اتحاد بھی ناممکن ہے۔ اندریں حالات ان کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ایک مذہبی جماعت لوگوں کے ایمان و اعتقاد کا جائزہ لینے کے لئے حکومت کیطرف سے قائم کی ہوئی تحقیقاتی مجالس کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے۔ اپنے خیال کی تائید میں انھوں نے کارڈینل ہنری مین کا ایک اقتباس پیش کیا ہے۔ اور مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آیا اسلام میں کارڈینل مذکور ہی کے اصول پر عمل کیا جائے گا؟ پنڈت جی کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام کی ہیئت ترکیبی کو کیتھولک مسیحیت سے کوئی نسبت نہیں جس میں عقائد کی کثرت، اُن کی پیچیدگی اور فوق العقل حیثیت کی وجہ سے ملحدانہ تاویلات کا دروازہ جیسا کہ خود تاریخ سے ظاہر ہے ہمیشہ کھلا رہے گا۔ برعکس اس کے اسلام ایک سیدھا سادا مذہب ہے جسکی بنا صرف دو قضایا پر ہے۔ اول یہ کہ خدا ایک ہے۔ ثانیاً یہ کہ محمد صلعم انبیاء کے اس سلسلہ کے جو انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے دنیا میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے خاتم ہیں لہذا اگر عقیدے کی تعریف جیسا کہ بعض مسیحی علماء کا خیال ہے یوں ہی کیجا سکتی ہے کہ وہ ایک فوق العقل قضیہ ہے جسکو وحدت دین کی خاطر تسلیم کر لینا چاہئے۔ خواہ اس کا مابعد الطبیعی پہلو

سمجھ میں آئے یا نہیں تو پھر اسلام کے دونوں قضایا پر کسیطرح بھی لفظ عقیدہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کا تعلق تمام بنی نوع انسان کے محسوسات و مدرکات سے ہے اور ہم بآسانی ان کی صحت پر استدلال کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مذہب کی بنیاد ایسے صاف اور سادہ اصولوں پر ہو اس میں کسی ایسے الحاد کا سوال جسکا مرتکب درجہ کفر کو پہنچ جائے صرف اسوقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم ان میں سے کسی ایک یا دونوں کا انکار کریں۔ تاریخ اسلام میں اس قسم کے الحاد کی مثالیں نہایت شاذ ہیں اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا کیونکہ دین اسلامی اگرچہ اپنی حدود پر مصر ہے بایں ہمہ اس نے ان حدود کے اندر آزادی تاویل کی اجازت دے رکھی ہے۔ چونکہ اسلام میں یہ الحاد جسکا مرتکب فی الواقعہ حدود دین سے تجاوز کرے بہت کم پیش آیا لہذا جب کبھی اس قسم کی کوئی بغاوت رونما ہوئی مسلمانوں کے لئے انتہائی رنج اور اشتعال کا موجب ہوئی یہ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ ایرانی مسلمانوں کے جذبات بڑی تیزی کیساتھ بہائیوں کے خلاف بھڑک اٹھے اور یہی بات کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمانان ہند شدت کے ساتھ قادیانیوں کے مخالف ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فرقہ ہائے اسلامی نے فقہ و دینیات کے فرعی مسائل میں اکثر ایک دوسرے کو کافر ٹھہرایا۔ لیکن آج کل کے بعض تعلیم یافتہ مسلمان جو اس بات سے تقریباً بے خبر ہیں کہ اسلامی دینیات کے یہ مختلف مسائل کس طرح رونما ہوئے اور ان کی تاریخ کیا ہے لفظ کفر کے اس عام اور غیر محتاط استعمال سے جسکا اطلاق فرعی نزاعات اور الحاد کی ان صورتوں میں بھی یکساں طور پر ہوتا ہے جب ان کا مرتکب دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ علامت ہے ملت اسلامیہ کے سیاسی اور اجتماعی زوال کی ان کا یہ خیال سراسر بے بنیاد ہے اسلئے کہ جب ہم اسلامی دینیات کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مسائل شرع میں ایک دوسرے کی تکفیر نے بجائے تفریق و انتشار کے دینیات کے لئے ایک اصول اتحاد کا کام دیا ہے۔ پروفیسر ہرگرونجی نے لکھا ہے "ایک طرف ائمہ اسلام نے ادنیٰ سے ادنیٰ اختلافات اور معمولی باتوں پر ایک دوسرے کو کافر ٹھہرایا ہے دوسری جانب ان ہی لوگوں نے متفقہ طور پر یہ کوشش کی کہ اپنے پیش روؤں کے اختلافات کو رفع کریں"۔ اسلامی دینیات کے طلباء اس امر سے خوب واقف ہیں کہ مسلمانوں میں اس کفر کو اصطلاحاً کفر دون کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ جس شخص سے اس کفر کا ارتکاب ہو وہ دین اسلام سے خارج نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کفر دون کفر کا جا و بے جا استعمال ایک ایسا خطرناک حربہ ہے جس سے عام ملا زبردست فتنہ پیدا کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے ذہنی انحطاط کا یہ عالم ہے کہ انہیں دینیات کا ہر اختلاف بجائے خود کلی اور جملہ اصولوں پر حاوی نظر آتا ہے اور وہ

اپنی کم نظری کے ہاتھوں کثرت میں وحدت کا مشاہدہ ہی نہیں کر سکتے لیکن اس کا علاج یہ ہے کہ مذہبی درسگاہوں کو اسلام کی ائتلافی روح سے آشنا کیا جائے تاکہ انہیں ایک دفعہ پھر اس حقیقت کا احساس ہو کہ یہ منطق کے معارضات ہی تھے جو دینیات کے اندر اجتہاد کا باعث ہوئے رہا وہ اختلاف جو فی الواقعہ کفر کا موجب ہو اس کے لئے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا کسی مصلح یا مفکر کی تعلیمات حدود اسلامی سے تجاوز تو نہیں کرتیں ہے اب یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ قادیانیت کی بحث میں یہ مسئلہ خواہ مخواہ رونما ہو جاتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ احمدی جماعت دو فرقوں پر منقسم ہے، قادیانی اور لاہوری۔ قادیانی کھلم کھلا اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ بانی احمدیت ہر اعتبار سے نبی تھے البتہ لاہوری جماعت نے یا تو واقعی اپنے اعتقادات یا کسی حکمت عملی کی بنا پر احمدیت کے اندر کسیقدر ترمیم کر دی ہے اور یہ مسئلہ کہ آیا بانی احمدیت نے سچ مچ نبوت کا دعوی کیا اور اس کے انکار سے کفر لازم آتا ہے دونوں جماعتوں کے درمیان متنازعہ فیہ ہے بہرکیف میرے لئے اس امر کا فیصلہ کرنا کہ ان دونوں میں کون سچا ہے ضروری نہیں۔ میں بوجوہ سمجھتا ہوں ــــ ان وجوہ کی تشریح آگے آتی ہے۔ کہ ایک ایسی نبوت کا عقیدہ جس کا منکر دین اسلام سے خارج ہو جائے احمدیت کے لئے ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاہوریوں کی نسبت قادیانی فریق کا موجودہ پیشوا اس تحریک کے اصل راستہ پر کہیں زیادہ صحت کے ساتھ چل رہا ہے۔

تہذیب و شائستگی کی نظر سے دیکھا جائے تو عقیدۂ ختم نبوت کو جو اہمیت حاصل ہے اسکی تشریح میں نے کسی دوسری جگہ کر دی ہے۔ اس کا مطلب بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ جناب محمد مصطفےٰ صلعم کے بعد روحانی اعتبار سے کسی شخص کی غلامی اختیار نہ کیجائے اس لئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پیروؤں کو ایک ایسا قانون عطا فرمایا جو ضمیر انسانی کی اندرونی گہرائیوں سے مترتب ہوا اور اس طرح ان کی نجات اور آزادی کا راستہ کھول دیا۔ شرعی الفاظ میں ہم یہ کہیں گے کہ وہ سیاسی اجتماعی نظام جسے ہم "اسلام" سے تعبیر کرتے ہیں کامل و مکمل بھی ہے اور ہمیشہ کے لئے بھی یعنی ابدی اور دوامی۔ آنحضرت صلعم کے بعد کسی ایسی وحی یا الہام کا امکان نہیں جسکا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہو۔ جو کوئی اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے اسلام سے غداری کرتا ہے۔ چونکہ قادیانی اس بات کے قائل ہیں کہ بانی احمدیت پر ایسی ہی وحی (جس کا انکار کفر کو مستلزم ہے) نازل ہوتی رہی لہذا وہ اپنے سوا تمام دنیائے اسلام کو کافر سمجھتے ہیں۔ خود ان کے پیشوا کی دلیل یہ تھی کہ اگر آنحضرت صلعم کی روحانیت کوئی دوسرا نبی پیدا نہیں کر سکتی تو اس کا ناقص ماننا لازم آئے گا

وہ اپنی نبوت کو اس بات کی حجت ٹھہراتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی روحانیت نبی تراش ہے۔ لیکن اگر آپ یہ دریافت کریں کہ آیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیض روحانیت ایک سے زائد نبی پیدا کر سکتا ہے تو اسکا جواب یہ ہو گا کہ نہیں۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ "محمد صلعم خاتم النبیین نہیں۔ میں آخری نبی ہوں" بجائے اس کے کہ بانی احمدیت کو عقیدہ ختم نبوت کی اس اہمیت کا احساس ہوتا جو اسے نوع انسانی کی تاریخ اور بالخصوص ایشیا میں حاصل ہے وہ غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ ختم نبوت کا یہ مفہوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو گیا اس بات کی دلیل ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت مکمل نہیں نفسیاتی لحاظ سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے خود اپنی نبوت کو منوانے کے لئے ایک طرف تو پیغمبر اسلام صلعم کی روحانیت کو نبی تراش کہا لیکن دوسری جانب یہ کہکر کہ اس روحانیت سے صرف ایک نبی پیدا ہو سکتا ہے یعنی بانی احمدیت حضور صلعم کے خاتم النبیین ہونے سے انکار کر دیا۔ یوں نبوت کا یہ نیا دعویدار پچھلے سے اپنے روحانی پیشوا یعنی آنحضرت صلعم کے منصب ختم نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔

وہ کہتا ہے میں آنحضرت صلعم کا بروز ہوں گویا اسکا خاتم النبیین ہونا پیغمبر اسلام ہی کا خاتم النبیین ہونا ہے مطلب یہ کہ اسطرح حضور صلعم کے منصب ختم نبوت پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن اس طرح اپنے خاتم النبیین ہونیکو رسول اللہ صلعم کے خاتم النبیین ہونے کا مترادف قرار دیتے ہوئے بانی احمدیت نے ختم نبوت کے زبانی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ۱

بہرکیف بات تو ظاہر ہے کہ اگر بروز کے معنی انتہائی مشابہت کے لئے جائیں تب بھی اس سے کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا کیونکہ بروز جس شے کا بروز ہے ہمیشہ اس سے الگ رہے گا۔ ہاں اوتاریت ۲ کے معنوں میں بروز اور اس کے اصل میں بیشک کوئی فرق نہیں رہتا۔ لہذا اگر بروز کا عبارت ہے "روحانی مشابہت" سے تو بانی احمدیت کی یہ دلیل بیکار ہو جاتی ہے۔ برعکس اس کے اگر بروز کے معنی تجسد یعنی اوتار بنکر آنے کے ہیں جیسا کہ اس لفظ کا آریائی مفہوم ہے تو پھر یہ دلیل فی الواقعہ قابل قبول ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ماننا لازم آئے گا کہ جس شخص نے اسکو پیش کیا ہے اسکی ذہنیت سراسر مجوسیانہ ہے۔

جماعت احمدیہ کا ایک اور دعویٰ ہے اور اس کے لئے اندلس کے مشہور صوفی حضرت شیخ

---

حاشیہ:- ۱۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے باوجود پہلے اور بعد کا سوال تو بدستور قائم رہتا ہے

۲۔ کسی شے کا کسی دوسری شے میں تجسد اختیار کرنا جسطرح ہندو پرمیشور اوتار کے قائل ہیں فلہذا "اوتاریت"۔

محی الدین ابن عربی کی سند پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ شیخ کے نزدیک اولیائے اسلام اپنے روحانی معراج میں کمالات نبوت سے مستفیض ہو سکتے ہیں میری اپنی رائے میں اگرچہ شیخ اکبر کا یہ خیال نفسیاتی اعتبار سے صحیح نہیں لیکن بالفرض اسے ٹھیک مان لیا جائے تب بھی قادیانیوں کا دعویٰ سراسر غلط ہے کیونکہ انھیں شیخ کے حقیقی مدعا کا علم نہیں جو اس بات کے قائل تھے کہ یہ صرف کسی شخص کا ذاتی کمال ہوگا۔ یہ نہیں کہ اسکی بناپر کوئی ولی اس امر کا دعویٰ کرے کہ جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ ابن عربی کا تو یہ بھی خیال تھا کہ امت اسلامیہ میں ایک نہیں بلکہ بہت سے اولیا ایک ہی وقت حتیٰ کہ ایک ہی ملک میں کمالات نبوت سے مستفیض ہو سکتے ہیں لہذا اس امر کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کہ اگرچہ شیخ کے نزدیک اولیائے اسلام کا نفسیاتی اعتبار سے کمالات نبوت کو حاصل کر لینا بالکل ممکن ہو بایں ہمہ سیاسی اجتماعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ان واردات کی بناپر کسی ولی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی ایک الگ جماعت تیار کرے اور یہ کہے کہ ہماری جماعت میں داخل ہونا ہی کفر و اسلام کا معیار ہے لیکن اگر محی الدین ابن عربی کی متصوفانہ نفسیات سے قطع نظر کر لیجائے اور ہم اس مسئلہ پر "فتوحات" کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ اندلس کا یہ جلیل القدر صوفی ختم نبوت پر اسی طرح ایمان رکھتا تھا جس طرح دوسرے راسخ العقیدہ مسلمان بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر کہیں شیخ کو عالم کشف میں اس بات کا پتہ چل جاتا کہ ایک دن مشرق میں تصوف کے بعض ہندوستانی پرستاران کی متصوفانہ نفسیات کو حجت ٹھہراتے ہوئے ختم نبوت کا انکار کر دینگے تو وہ مسلمانوں کو ان غداروں کے خلاف ہندی علماء سے بھی بہت پہلے متنبہ کر دیتے

جہاں تک احمدیت کی روح کا تعلق ہے اس کے ماخذ اور اس امر کی بحث کہ قبل اسلام کے مجوسی خیالات نے کس طرح اسلامی تصوف کے ذریعے بانیٔ احمدیت کے ذہن کو متاثر کیا، ان لوگوں کے لئے بے حد دلچسپ ہوگی جو ادیان و مذاہب کا مطالعہ ان کے باہمی مقابلہ سے کرتے ہیں۔ لیکن میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ یہاں اس بحث کا آغاز کیا جائے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ احمدیت کی صحیح روح قرون وسطیٰ کے تصوف اور دینیات میں پوشیدہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کے علماء نے اسے محض ایک دینی تحریک سمجھکر دینیات ہی کے حربوں سے اس کی روک تھام شروع کی۔ میرے نزدیک ان کا یہ طریق غلط تھا۔ اسی لئے ان کو کچھ بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر بانیٔ احمدیت کے الہامات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ غالباً ان کی اندرونی زندگی اور صحیح شخصیت کے تجزیے کا سب سے زیادہ روشن اور کامیاب ذریعہ ہوگا۔ اس سلسلے میں مجھے ان الہامات کی طرف اشارہ کر دینا چاہیے جن کا ایک مجموعہ مولوی منظور الٰہی صاحب نے شائع کیا ہے۔ اور جس میں نفسیاتی تحقیق کا نہایت متنوع اور مختلف ذخیرہ موجود ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب بانیٔ احمدیت کی سیرت و شخصیت کی کنجی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن جدید نفسیات کا کوئی نوجوان طالب علم ضرور سنجیدگی کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے گا۔ اگر اس نے اپنی تحقیقات کا معیار قرآن پاک کو ٹھہرایا جیسا کہ لازماً اسے ٹھہرانا پڑے گا گو یہاں اس کی تشریح کا موقعہ نہیں اور اپنے مطالعہ میں بانیٔ احمدیت کے علاوہ ان کے غیر مسلم معاصرین مثلاً رام کرشن بنگالی کی زندگی کو بھی زیر نظر رکھا تو اسے ان واردات کی اصلی ماہیت کو دیکھ کر تعجب ہوگا جن کی بنا پر بانیٔ احمدیت کے لئے منصب نبوت کا دعویٰ کیا جاتا ہے +

لیکن نفسیاتی بحث سے ہٹ کر دیکھا جائے تو اس کا ایک نہایت مؤثر اور نتیجہ خیز ذریعہ یہ ہے کہ اور نہیں تو کم از کم ۱۷۹۹ء سے مسلمانان ہند کے دینی افکار کی جو کیفیت رہی ہے ان کی روشنی

میں اس امر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ احمدیت کے اندر فی الحقیقت کیا چیز پوشیدہ ہے۔ تاریخ اسلام میں ۱۷۹۹ء کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اسی سال میسور کی اسلامی ریاست کا خاتمہ ہوا اور اس کے خاتمہ کے ساتھ ہی مسلمانوں کی یہ امیدیں ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گئیں کہ انہیں ہندوستان میں سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ ۱۸۲۷ء میں ترکی بیڑہ نوارنیو میں تباہ ہوا۔ جو لوگ سرنگا پٹن گئے ہیں انھوں نے دیکھا ہو گا کہ سلطان شہید کے روضے پر انکی تاریخ وفات کندہ ہے۔

روم اور ہند کی عظمت کا چراغ گل ہو گیا

لیکن جس کسی نے یہ تاریخ کہی تھی، اسے کیا معلوم تھا کہ وہ مستقبل کے واقعات کا صحیح اظہار کر رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۷۹۹ء ایشیا میں اسلام کے زوال وانحطاط کا انتہائی زمانہ ہے۔ مگر جس طرح معرکۂ ژینا کی ذلت آمیز شکست جدید المانیہ کا باعث ہوئی اسی طرح ۱۷۹۹ء میں موجودہ دنیائے اسلام اور اس کے مسائل کا ظہور ہوا۔ اس امر کی مزید تفصیل آگے چل کر آئے گی۔ سردست ہمیں ان سوالات میں سے چند ایک پر نظر رکھنی چاہیئے جو سلطان شہید کے زوال اور ایشیا میں مغربی شہنشاہیت کے نشوونما پر مسلمانان ہند کے اندر رونما ہوئے۔

کیا **خلافت** ایک دینی ادارہ ہے؟ ہندوستانی مسلمانوں اور اسی طرح وہ مسلمان جو دولت عثمانیہ کے زیر حکومت نہیں ان کا **عثمانی خلافت** سے کیا تعلق ہے؟ ہندوستان دَارُ الحَرب ہے، یا دَارُ الاِسلَام؟ **جہاد** کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ قرآن پاک کی اس آیت میں کہ اَطِیعُوا اللّٰہَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ وَاُولِی الاَمرِ مِنکُم میں لفظ "تم میں سے" کے معنی کیا ہیں؟ ظہور مہدی کے متعلق جو احادیث آئی ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل تھے جو بوجوہ صرف ہندوستان ہی کے مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ مغربی شہنشاہیت کو بھی جس کا اثر عالم اسلام میں دن بدن بڑھ رہا تھا ان سے بے حد دلچسپی تھی بہرکیف اس طرح جو اختلافات رونما ہوئے ان کا تذکرہ نہایت دلچسپ ہے اور ہندوستان میں اسلامی دینیات کا یہ طویل افسانہ ایک ایسے قلم کا منتظر ہے جس میں زور بھی ہو اور طاقت بھی۔

مسلمان ارباب سیاست جن کی نظر واقعات پر تھی کسی نہ کسی طرح اس بات میں کامیاب ہو گئے

کہ ملت کا ایک فریق مذہبی اعتبار سے بھی وہی روش اختیار کرے جو مقتضائے وقت کے مطابق ہے۔ لیکن اس کامیابی کے باوجود یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اعتقادات جو صدیوں سے مسلمانوں کے اندر راسخ ہو چکے ہیں، محض زور دلائل سے مٹ جاتے؟ ان حالات میں منطق کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں سیاسی مصالح کا عذر یا قرآن و حدیث کی نئی تفسیر۔ لیکن دونوں صورتوں میں اس کی ناکامی یقینی ہے، جمہور اسلام کو مذہب سے جو گہرا تعلق ہے۔ اس کے ماتحت صرف ایک ہی چیز کارگر ہو سکتی تھی اور وہ احکام خداوندی کا خوف۔ لہٰذا ان مسائل کو سیاسی اعتبار سے ایک نئے رنگ میں پیش کرنے کے لئے وحی و الہام کی ضرورت تھی تاکہ اس ضمن میں دین کے صحیح عقائد کا ازالہ ہو جائے۔ یہ ضرورت احمدیت نے پوری کی جسے خود قادیانی بھی برطانوی شہنشاہیت کی سب سے بڑی خدمت تصور کرتے ہیں، اس لئے کہ مذہب کے ان مسائل پر جنکا ایک پہلو سیاسی بھی ہے، وحی و الہام کو حجت ٹھیرانا گویا اس امر کا اعلان کرنا ہے کہ جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اول درجہ کے کافر اور نار جہنم کے سزا وار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وفات مسیح کے ساتھ یہ عقیدہ اختیار کر لینے سے کہ آنیوالا روحانی اعتبار سے اس کا "مثیل" ہوگا بظاہر اس تحریک پر عقلیت کا ملمع چڑھ گیا ہے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان عقائد کا احمدیت کی روح اور اس کے حقیقی جوہر سے کوئی تعلق نہیں۔ میری رائے میں یہ صرف تمہید تھی۔ ایک مکمل نبوت کا راستہ طیار کرنے کی۔ جس کے بغیر وہ تحریک جو سیاسی قوتوں کے زیر اثر از خود دلوں میں پیدا ہو چکی تھی کبھی کامیاب نہ ہوتی۔ جاہل ملکوں میں جس چیز کا اثر ہوتا ہے وہ منطق نہیں بلکہ ادعا و تحکم۔ ضرورت صرف جہالت اور زود اعتقادی کی ہے۔ جس میں تعجب ہے بعض اوقات چند ذہین آدمی بھی گرفتار ہو جاتے ہیں اور ایک ایسے شخص کی جو نہایت بیباکی کے ساتھ وحی و الہام کا دعویٰ کر سکے۔ اور جسے یہ کہنے میں تامل نہ ہو کہ جس شخص نے اس کا انکار کیا وہ ہمیشہ کے لئے لعنت کا مستحق ہوگا اگر یہ دونوں باتیں موجود ہیں، تو کسی محکوم اسلامی سرزمین میں ایک سیاسی دنیات اور اس دنیات کی بنا پر ایک ایسی جماعت کا طیار کر لینا کچھ مشکل نہیں جو غلامی اور محکومیت کو عقیدۃً فرض قرار دے۔ پنجاب میں تو عقائد دین کا ایک بھونڈا سا مجموعہ بھی اس مطلب کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ یہاں کا دہقان جو صدیوں سے ہر قسم کے ظلم و ستم کا خوگر ہو چکا ہے، فوراً اسے

قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے تمام مذاہب کے راسخ العقیدہ پیروؤں کو یہ مشورہ دیا ہے۔ کہ وہ آپس میں مل جائیں اور اس چیز کو روکنے کی کوشش کریں جو ان کے نزدیک عبارت ہے۔ ہندوستانی وطنیت سے پنڈت جی کا یہ طعن آمیز مشورہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ احمدیت کو ایک اصلاحی تحریک سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جہاں تک مسلمانان ہند کا تعلق ہے اس نے ہمارے لئے سیاست اور مذہب دونوں کے اندر بڑے بڑے اہم مسائل پیدا کر دئے ہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، مذہبی غور و فکر کی تاریخ میں احمدیت کا فریضہ یہ رہا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ غلامی پر وحی والہام کو حجت ٹھہرائے۔ لہٰذا دینی بحثوں سے قطع نظر کرتے ہوئے محض سیاسی لحاظ سے دیکھا جائے تب بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے کس منہ سے ہمیں یہ الزام دیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک رجعت آمیز قدامت پرستی میں گرفتار ہیں۔ ان کو احمدیت کی صحیح غرض و غایت کا علم نہیں ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ ایک ایسی مذہبی تحریک کے خلاف جس نے ہندوستان کی تمام آفات و مصائب کو احکام الٰہیہ کے ماتحت جائز سمجھ رکھا ہے، مسلمانوں کا طرز عمل پسند نہ کرتے +

اب شاید اس بات کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں کہ اسلام کے رخساروں پر احمدیت کی جو زردی اس وقت چھا رہی ہے وہ مسلمانان ہند کی ذہنی تاریخ کا کوئی جدید مظہر نہیں۔ بلکہ ان خیالات کا نتیجہ ہے جو بانیٔ احمدیت کی پیدائش سے بہت پہلے دلوں میں موجزن تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بانی احمدیت اور ان کے رفقاء نے اپنے لئے جو پروگرام وضع کیا عمداً کیا تھا۔ مجھے تو اس بات سے بھی انکار نہیں کہ اس (بانیٔ احمدیت) نے فی الواقع ایک آواز سنی۔ بحث صرف یہ ہے کہ آیا یہ آواز خدا کی طرف سے تھی جس کے ہاتھ میں زندگی بھی ہے اور طاقت بھی یا محض لوگوں کے روحانی افلاس کی پیدا کردہ؟ اس کا فیصلہ اس بات پر ہے کہ ہم اس تحریک کی صحیح ماہیت پر غور کریں۔ جو اس آواز سے مترتب ہوئی اور یہ دیکھیں کہ جن لوگوں نے اس پر کان دھرا ان کے افکار و جذبات نے کیا شکل اختیار کی۔ یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں نے جو کچھ کہا استعارۃً کہا ہے۔ قوموں کی تاریخ حیات سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ جب کسی قوم کے انحطاط کا زمانہ قریب آیا ہے تو اس کا زوال ہی اسکے لئے الہام و القاء کا سرچشمہ بن گیا ہے اور پھر

ان میں جو کوئی بھی پیدا ہوا خواہ وہ شاعر ہو یا فلسفی ولی یا سیاستداں اس نے غلامی ہی کا وعظ کہا اور ہمیشہ اس امر کی کوشش کی کہ اپنی قوت استدلال اور سحر آفرینیوں سے ہر اس شے کی تعریف کرے جسے حیات انسانی میں ذلیل، ناسزا اور قبیح تصور کیا جاتا ہے۔ غلامی اور محکومیت کے یہ پیغمبر اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کے بظاہر امید سے لبریز الفاظ میں ناامیدی پوشیدہ ہے۔ وہ ہر اس چیز کو جسے ملت کا اخلاق عزیز رکھتا ہے، تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ اس طرح جو لوگ ان کے فریب میں آتے ہیں اپنی روحانی قوتوں کو ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھتے ہیں ذرا ان لوگوں کی بے غیرتی اور زبوں ہمتی کا اندازہ تو کیجئے، جنہیں خدا کے نام پر اس امر کی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ جس سیاسی فضا میں پیدا ہو چکے ہیں اس سے آزادی ممکن نہیں میری رائے میں وہ تمام کھلاڑی جنہوں نے احمدیت کا کھیل کھیلا زوال و انحطاط کا آلہ کار تھے۔ اس طرح کا ایک ناٹک ایران میں بھی قایم ہوا تھا مگر اس سے وہ نتائج مرتب نہیں ہوئے اور نہ ان کے مترتب ہونے کا کوئی امکان تھا جو احمدیت نے سیاست و مذہب کے اندر ہمارے لئے پیدا کر دیئے ہیں۔ روس نے بابیت کیساتھ رواداری کا برتاؤ کیا اور اسے اجازت دی کہ وہ عشق آباد میں اپنا تبلیغی مرکز قائم کرے۔ انگلستان نے بھی احمدیوں سے ایسا ہی برتاؤ کیا۔ اور انہوں نے ووکنگ میں تبلیغ و دعوت کے نام پر اپنی پہلی مسجد تعمیر کی۔ اگرچہ ہمارے لئے اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا روس اور انگلستان کی یہ رواداری کسی سیاسی مصلحت کا نتیجہ تھی یا فی الواقعہ وسعت مشرب سے مترتب ہوئی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ایشیا میں اس رواداری نے مسلمانوں کے لئے بڑی بڑی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ خود میرے ذہن میں اسلام کا جو تصور ہے اسکو دیکھتے ہوئے یقین ہوتا ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن ان سب فتنوں سے پاک و صاف ہو کر نکلے گا۔ دنیا بدل گئی۔ ہندوستان بدل رہا ہے، اور جمہوریت کی نئی روح جو آج اس ملک میں پھیل رہی ہے بہت جلد احمدیوں کی آنکھیں کھول دیگی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انکی دینی ایجادات کسقدر بے کار تھیں۔

مزید براں اسلام کو اب یہ بھی گوارا نہیں کہ از منہ متوسط کا وہ تصوف جس نے مسلمانوں کے

کے صحیح رجحانات کو ایک مبہم غور و فکر میں تبدیل کر دیا تھا از سر نو زندہ کیا جائے۔ یہ اسی تصوف کا نتیجہ تھا کہ پچھلی چند صدیوں میں ہمارے بہترین دل و دماغ اس کی نذر ہو گئے اور حکومت و سیاست کی زمام معمولی انسانوں کے ہاتھوں میں رہ گئی۔ اسلام کو اب بار بار تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں علی ہذا وہ پنجاب کے اس تجربے کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا جس نے گذشتہ پچاس برس سے مسلمانوں کی توجہ ان مسائل میں الجھا رکھی ہے۔ جنکا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام نے فکر اور عمل کی نئی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ اور نبوت یا ولایت کا کوئی دعویدار اب اسے از منہ متوسطہ کی ان تاریکیوں میں کیونکر الجھا سکتا ہے۔ جو اسوقت کے مخصوص تصوف سے رونما ہوئیں ۔

---

اب مجھے پنڈت جواہر لال نہرو کے استفسارات کا جواب عرض کرنا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کو انیسویں صدی کی اسلامی تاریخ یا اس عہد کے مذہبی حالات کا کچھ علم نہیں۔ انھوں نے شاید میری ان تحریروں کا بھی مطالعہ نہیں کیا جن میں ایک طرح سے ان کے سوالات ہی سے بحث کی گئی ہے لیکن یہاں نہ تو اس بات کا امکان ہے کہ ان تحریروں کو از سر نو پیش کیا جائے اور نہ اس امر کی تفصیل کا موقعہ ہے کہ انیسویں صدی میں مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کیا رہی جس کے بغیر دنیائے اسلام کے موجودہ حالات کو سمجھنا دشوار ہے یوں ترکی اور اسلام کے عہد حاضر پر آئے دن سینکڑوں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں میں نے ان کا بہت سا حصہ پڑھا ہے اور غالباً پنڈت جی نے بھی انکو دیکھا ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک تصنیف بھی ایسی نہیں جسکا لکھنے والا نتائج کی صحیح ماہیت کو سمجھتا ہو یا جسے کم از کم اس بات ہی کا علم ہو کہ وہ کیا اسباب تھے جو ان نتائج کے محرک ہوئے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں مسلمانوں کے غور و فکر نے جو شکل اختیار کی اس کے بعض اہم مظاہر کی طرف مختصراً اشارہ کر دیا جائے۔

میں نے کسی دوسری جگہ بیان کیا تھا کہ ۱۷۹۹ء میں اسلام کا سیاسی زوال انتہا کو پہنچ گیا۔ لیکن یہ اسکی اندرونی قوت کا ایک ناقابل انکار ثبوت ہے کہ اسے فوراً ہی اپنی صحیح حیثیت کا احساس ہونے لگا۔ انیسویں صدی ہی میں سرسید احمد خاں، ہندوستان، سید جمال الدین افغانی، افغانستان اور مفتی عالم جان روس میں پیدا ہوئے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ حضرات محمد بن عبدالوہاب سے متاثر ہوں جنکی ولادت ۱۷۰۰ء میں سرزمین نجد میں ہوئی اور جنھوں نے اگرچہ اس تحریک کی بنا رکھی جو عرف عام میں وہابیت سے تعبیر کی جاتی ہے لیکن جس کے متعلق یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ پہلا موقع تھا جب موجودہ عالم اسلام نے اپنے اندر زندگی کی حرکت محسوس کی۔ بہرکیف سید احمد خاں کا اثر زیادہ تر ہندوستان ہی میں محدود رہا وغالباً پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے آنیوالی دور کی جھلک دیکھی اور اس بات کو سمجھ گئے کہ یہ زمانہ قطعی اور اثباتی علوم کا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے لئے جو نسخہ تجویز کیا وہ یہ تھا کہ ہمیں جدید تعلیم حاصل کرنی

چاہئے۔ یہی رائے مفتی عالم جان کی رہی تھی۔ مگر سید احمد خاں کی حقیقی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں پہلی مرتبہ اس امر کو محسوس کیا کہ اسلام کو ایک نئے رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت ہے اور پھر خود ہی اسکی طرف قدم بڑھایا۔ ہمیں ان کے مذہبی خیالات سے اتفاق نہیں لیکن اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ انہیں کا احساس قلب تھا جو سب سے پہلے جدید اثرات کی مزاحمت پر آمادہ ہوا۔

مگر ہندوستانی مسلمانوں کی انتہائی قدامت پرستی انھیں حقائق سے غافل کر چکی تھی اور وہ سید احمد خاں کے مذہبی طرز عمل کا صحیح مطلب سمجھنے سے قاصر رہے۔ برعکس اس کے شمال مغربی ہندوستان میں جہاں اس ملک کے دوسرے صوبوں کی نسبت جہالت اور پیر پرستی کا زور ہے سرسید کی تحریک کے تھوڑے ہی دنوں بعد احمدیت کا ردعمل شروع ہوا جو بجائے خود ایک عجیب و غریب آمیزش ہے سامی اور آریائی تصوف کی اور جس نے مسلمانوں کی روحانی اصلاح کے لئے تزکیہ نفس کو ضروری نہیں سمجھا جیسا کہ قدیم اسلامی تصوف کا خیال تھا۔ بلکہ یہ کہکر جمہور کی تسلی کر دی کہ جس مسیح "موعود" کی دنیا منتظر تھی وہ آگیا۔ احمدیت کے نزدیک اس مسیح "موعود" کا یہ منصب نہیں کہ وہ افراد کو زوال و انحطاط کی مذلتوں سے نجات دلائے۔ اسکی تعلیم یہ ہے کہ

بندگی اور غلامی کے آگے سر تسلیم خم کر دو۔ لہذا غور سے دیکھا جائے تو یہ ردعمل آپ ہی اپنی نفی کرتا ہے کیونکہ ایک طرف تو اس نے اسلام کے خارجی ضوابط کو قائم رکھا ہے لیکن دوسری جانب اس قوت ارادی کو برباد کر دیا جسکا استحکام ان ضوابط سے مقصود ہے۔

مولینا سید جمال الدین افغانی ایک دوسری قسم کے انسان تھے۔ خدا تعالیٰ کی حکمتیں بھی عجیب ہیں۔ دنیائے اسلام کے بلند ترین افراد میں جنکا تعلق عہد حاضر سے ہے ایک کی پیدائش افغانستان میں ہوئی۔ سید صاحب تمام اسلامی زبانوں کے ماہر تھے اور ان کی فصاحت و بلاغت جادو کا اثر رکھتی تھی۔ ان کی بے چین روح نے کبھی انکو ایک ملک میں ٹھہرنے نہ دیا بلکہ وہ ہمیشہ ایک اسلامی سرزمین سے دوسری اسلامی سرزمین میں تشریف لیگئے اور اسطرح ترکی، ایران اور مصر کے ممتاز ترین انسانوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا۔ ہمارے عہد کے بعض زبردست علماء مثلاً مفتی محمد عبدہ، علی ہذا وہ لوگ جنھوں نے آگے چلکر نئی پود کی سیاسی قیادت اختیار کی انہیں کے شاگردوں میں سے تھے۔ ہمارا مطلب ہے سعد زاغلول پاشا اور دوسرے رہنماؤں

سے۔ انھوں نے لکھا کم لیکن کہا بہت یہ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ جو لوگ ان کے فیض صحبت سے مستفید ہوتے رہے وہ بجائے خود چھوٹے چھوٹے جمال الدین بن گئے۔ سید صاحب کو نہ رسالت کا دعویٰ تھا نہ مجددیت کا۔ بایں ہمہ جدید دنیائے اسلام میں زندگی کی جو حرکت انھوں نے پیدا کی ہے اسکی نظیر ابتک نہیں ملتی انکی روح اس وقت بھی سرگرم کار ہے اور کون جانتا ہے کہ اسکی انتہا کہاں ہوگی۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال کیا جائے کہ ان جلیل القدر ہستیوں کے مقاصد اور عزائم کیا تھے اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے دنیائے اسلام پر تین قوتوں کو مسلط پایا جنکی تفصیل آگے آتی ہے۔ اور پوری کوشش کی کہ جہانتک ہوسکے مسلمانوں کو ان کے استیصال پر آمادہ کریں۔

۱۔ **ملائیت** ــــ علماء کا وجود اگرچہ اسلام کے لئے زبردست قوت کا باعث رہا ہے لیکن امتداد زمانہ اور بالخصوص زوال بغداد کیساتھ انھوں نے رفتہ رفتہ یہاں تک قدیم الخیالی اختیار کرلی کہ ان کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ انیسویں صدی میں وہابیت کی جو تحریک پھیلی ہے اور جس سے مصلحین اسلام بے حد متاثر ہوئے دراصل ایک بغاوت تھی علماء کے اسی جمود اور تقلید پرستی کے خلاف۔ لہٰذا اس عہد کے مصلحین کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر و تعبیر کے علاوہ آزادی اجتہاد کا حق حاصل کریں جسکی ضرورت دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں ہر وقت پیش آرہی تھی۔

۲۔ **تصوف** ــــ جمہور اسلام نے ایک مخصوص تصوف کے زیر اثر اپنی آنکھیں حقائق سے بند کر رکھی تھیں۔ ان کے قوائے عمل دن بدن ضعیف اور شل ہوتے چلے گئے اور انھوں نے ہر قسم کے توہمات اختیار کرلئے۔ اسلام میں تصوف ایک قوت تھی جسکا منصب روحانی اعتبار سے افراد کی تعلیم و تربیت کرنا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ عام مسلمانوں کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ایک ذریعہ بن گیا۔ اس طرح بتدریج اور بالکل غیر شعوری طور پر مسلمان اپنا عزم اور ارادہ سب کھو بیٹھے یہانتک کہ ان میں شریعت کی سختیوں سے بچنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اسی تصوف کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ملت کو جدید حقائق کی طرف متوجہ کیا یہیں کہ ان پر ادبیت کا رنگ غالب تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اسلام کی حقیقی روح سے آشنا ہوں جو اس مادی عالم سے گریز کی بجائے اسکی فتح و تسخیر کا راستہ دکھلاتی ہے۔

۳۔ **سلاطین اسلام** ــــ مسلمان بادشاہوں کی آنکھیں صرف اس بات پر لگی تھیں

کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنا تاج و تخت قائم رکھیں۔ ایسا کرنے میں وہ ملک اور قوم کو بڑی بڑی رقم پر بیچنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا یہ خاص مقصد تھا کہ جمہور اسلام کے اندر اس صورت حالات کے خلاف نفرت اور بغاوت کا جذبہ پیدا کریں۔

یہاں اگرچہ اس امر کی تفصیل ممکن نہیں کہ ان مصلحین کی بدولت مسلمانوں کے افکار اور ان کے جذبات میں کیا تبدیلی رونما ہوئی۔ بایں ہمہ ایک بات ظاہر ہے اور وہ یہ کہ دنیائے اسلام میں آگے چل کر جن شخصیتوں کا ظہور ہوا مثلاً زاغلول پاشا رضا شاہ اور مصطفیٰ کمال ان کا راستہ باوجود اختلاف طبیعت کے بڑی حد تک انہی کا تیار کردہ ہے۔ مصلحین ملت کا کام تعبیر و استدلال اور تشریح و توضیح تک محدود تھا لیکن جو لوگ ان کے بعد میدان میں آئے وہ اگرچہ باعتبار تعلیم اپنے پیش روؤں سے بہت پیچھے تھے باینہمہ ان کی فطرت نہایت صحیح اور سلیم واقع ہوئی ہے اور ان میں اس قدر ہمت اور قوت موجود ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو زور اور جبر سے بھی ان باتوں کو منوا سکیں جو دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں ناگزیر ہیں۔ اس قسم کے لوگ غلطیاں ضرور کرتے ہیں لیکن تاریخ بتلاتی ہے کہ بعض اوقات انکی غلطیاں بھی فائدے سے خالی نہیں ہوتیں۔ ان کا دل منطق کی بجائے زندگی سے معمور ہوتا ہے اور یہ قوت صرف زندگی ہی میں پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے مسئلوں کو حل کرنیکے لئے ہمیشہ بے چین رہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ سید احمد خاں اور سید جمال الدین افغانی۔ علی ہذا بلاد اسلامیہ میں سید صاحب کے سینکڑوں شاگرد اور نجیت زدہ مسلمان نہیں تھے بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی تعلیم و تربیت پرانی وضع کے ملاؤں ہی کی بدولت ہوئی اور جو روحانی اور ذہنی اعتبار سے اسی فضا میں سانس لیتے رہے جسکی تعمیر نو کا انہیں بعد میں خیال پیدا ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے جدید اثرات کی کارفرمائی سے انکار ہے لیکن ترکی میں جو کچھ ہوا اور جس کا جلد یا بدیر دوسرے اسلامی ممالک میں ظہور پذیر ہونا لازمی ہے سراسر ان قوتوں کا نتیجہ ہے جو مدت سے خود مسلمانوں کے اندر سرگرم کار تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ محض سطحی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ سارا انقلاب بیرونی قوتوں کا رہین منت نظر آئیگا لہذا سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک اور بالخصوص ترکی نے فی الواقعہ اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا خیال ہے کہ ترک اب حقیقتاً مسلمان نہیں رہے۔ انھیں اس بات کا علم نہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے کسی شخص کا مسلمان یا کافر ہونا ایک فقہی

اور قانونی مسئلہ ہے جس کا فیصلہ ہمیشہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے ماتحت کیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص اسلام کے ان دو اصولوں یعنی توحید باری تعالیٰ اور آنحضرت صلعم کے خاتم النبیین ہونے کا قائل ہے تو اس کو بڑے سے بڑا ملا بھی اسلام سے خارج نہیں کر سکتا خواہ قرآن پاک اور شریعت کے متعلق اس کی تاویلات کتنی بھی غلط کیوں نہ ہوں۔ ممکن ہے پنڈت جی کے ذہن پر اتاترک کی ان خیالی یا حقیقی اصلاحات کا اثر ہو جو ترکی میں رائج ہوئیں۔ آیئے ہم ایک نظر ان کو بھی دیکھ لیں۔ کیا یہ ترکوں کے مادی رجحانات ہیں جن کو اسلام کا منافی تصور کیا جاتا ہے؟ اسلام میں ترک دنیا اور نفس کشی کا بہت کافی زور رہا ہے۔ وقت ہے کہ اب مسلمان حقائق کی طرف متوجہ ہوں۔ مذہب کے خلاف مادیت کا حربہ استعمال کرنا کچھ بہت زیادہ موزوں نہیں۔ ہاں صوفیت اور ملائیت کا ضرور اس سے استیصال ہو جاتا ہے۔ جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ عوام الناس کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کو اوہام میں مبتلا رکھیں۔ اسلام کو مادیت سے کوئی خدشہ نہیں۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے "دنیا میں تمہارا جو حصہ ہے اس کو مت بھولو"۔ ایک غیر مسلم کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ مسلمانوں کے اندر مادی رجحانات کی ترقی دراصل شعوبذات ہی کی ایک شکل ہے جیسا کہ پچھلی چند صدیوں کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ پھر کیا تبدیلی لباس یا لاطینی رسم الخط کا اختیار کر لینا اس بات کی دلیل ہے کہ ترک اب مسلمان نہیں رہے۔ حالانکہ بحیثیت ایک دین نہ اسلام کا کوئی وطن ہے اور نہ بحیثیت ایک جماعت اس کی کوئی زبان یا مخصوص لباس۔ قرآن پاک کو ترکی میں تلاوت کرنے کی ایک مثال بھی تاریخ اسلام میں موجود ہے۔ گو میرے نزدیک یہ ایک نہایت ہی غلط اجتہاد ہے اس لئے کہ جن لوگوں نے عربی اور ادب عربی کا مطالعہ کیا ہے وہ اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں کہ غیر مغربی زبانوں میں سوائے اس (عربی) کے اور کسی کا مستقبل نہیں بہرکیف اب تو یہ اطلاعات بھی آنے لگی ہیں کہ ترکوں نے اپنے اس فیصلہ کو بدل دیا ہے۔ ممکن ہے تعدد ازدواج کی ممانعت یا علما کے لئے اجازت ناموں کا حصول اسلام کے خلاف قرار دیا جائے۔ لیکن فقہ اسلامی کی رو سے ایک اسلامی حکومت کا امیر اس بات کا مجاز ہے کہ شریعت کی دو رخصتوں، کو معطل کر دے بشرطیکہ اسے یقین ہو کہ لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔ رہی یہ بحث کہ علما کے لیے لائسنس یا پروانوں کا حاصل کرنا ضروری ہے سو یہ ایک ایسی اصلاح ہے کہ اگر مجھے اختیار ہوتا تو آج ہی اسے ہندوستان میں نافذ کر دیتا کیا یہ صحیح نہیں کہ مسلمانوں کی جہالت اور سادہ لوحی بڑی حد تک ملانوں ہی کی من گھڑت داستانوں

نتیجہ ہے؟ اتاترک کا ان لوگوں کو قوم کی دینی زندگی سے الگ کر دینا ایک ایسا فعل ہے جس کا امام ابن تیمیہ یا حضرت شاہ ولی اللہ دلی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے۔ مشکوٰۃ میں نبی کریم صلعم کی ایک حدیث بیان کی گئی ہے کہ وعظ و تبلیغ کا حق صرف مسلمانوں کے امیر یا اس کے مقرر کئے ہوئے لوگوں کو حاصل ہے معلوم نہیں مصطفےٰ کمال کو اس حدیث کا علم ہے یا نہیں بایں ہمہ ایک عجیب بات ہے کہ رئیس جمہوریہ کے اسلامی ضمیر نے کس طرح اس معاملہ میں اسکی رہنمائی کی۔ سوئس قانون کا اختیار کرنا ضرور ایک شدید غلطی ہے جس کا ارتکاب شاید محض اصلاح کے جوش میں کیا گیا ہے اور جو ایک ایسی قوم میں جسے بہت تیزی کیساتھ آگے بڑھنا ہے ایک حد تک قابل درگذر بھی ہے۔ تاریخ سبتلاتی ہے کہ جب کسی ملک میں دینی پیشواؤں کی سختیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور اس نے ایک طویل مدت کے بعد ان سے نجات حاصل کی ہے تو ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگ اپنے راستہ سے بھٹک جائیں۔ بہرکیف ترکی اور ترکی کیساتھ تمام دنیائے اسلام کو ابھی اسلامی قانون وراثت کے نامعلوم معاشی پہلوؤں پر غور کرنا ہے جو بقول فان کریمر فقہ اسلام کی ایک نہایت ہی اچھوتی اور بدیع شاخ ہے۔ اب مسیخ خلافت اور مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ جہانتک اسلام کی روح کا تعلق ہے اس نے کبھی سلطنت کی حمایت نہیں کی لہذا اتاترک کا ایک ایسے نظام خلافت کو منسوخ کرنا جس نے دولت امویہ کے زمانے سے ایک قسم کی سلطنت کی شکل اختیار کر رکھی تھی دراصل مقتضائے اسلام ہی کو پورا کرنا ہے۔ مسئلہ خلافت میں ترکوں کا جو اجتہاد ہے اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں اسلام کے مشہور فلسفی مورخ علامہ ابن خلدون کی رہنمائی حاصل کرنا ہوگی جنہیں بجا طور پر تاریخ جدید کا آدم تصور کیا جاتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ میں یہاں اپنی کتاب "تشکیل جدید" کا ایک اقتباس پیش کر دوں۔

ابن خلدون نے اپنے مشہور و معروف مقدمہ تاریخ میں عالمگیر اسلامی خلافت کے متعلق تین نظرئے بیان کئے ہیں اول یہ کہ عالمگیر خلافت کا ادارہ خدا کی طرف سے ہے لہذا اس کا قیام فرض ہے۔ دوم یہ کہ اسکا تعلق مقتضیات سے ہے اور تیسرے یہ کہ اس کا وجود مطلقاً ضروری نہیں۔ یہ آخری نظریہ خوارج کا تھا جو اسلام کے ابتدائی جمہوریین میں ترکوں کا رجحان غالباً پہلے کی بجائے دوسرے نظرئے کی طرف ہے یعنی معتزلہ کے اس خیال کی جانب کہ عالمگیر امامت کا قیام صرف مصلحتاً اور ضرورتاً پیش آتا ہے۔ ترک کہتے ہیں کہ امور سیاست پر غور کرتے ہوئے ہمیں اپنے گذشتہ تجربے کو فراموش نہیں کر دینا چاہیئے اور وہ یہ کہ

عالمگیر خلافت کا تخیل عملاً کامیاب نہیں رہا جب تک اسلامی سلطنت قائم رہی اس پر عمل درآمد ہوتا رہا لیکن جب سے آزاد اسلامی ریاستیں وجود میں آئی ہیں عالمگیر خلافت کا اصول خود بخود معطل ہو گیا۔ لہذا اگر آج مسلمان پھر منظم ہونا چاہتے ہیں تو یہ اصول کارگر ثابت نہیں ہوگا۔

علیٰ ہذا ریاست اور مذہب کی علیحدگی کا تخیل بھی مسلمانوں میں پہلے ہی سے موجود ہے اور شیعوں کے اس عقیدے کا لحاظ رکھ لیا جائے جس کا تعلق امام کی غیبت کبریٰ سے ہے تو ایران میں یہ علیحدگی کب سے عمل میں آ چکی ہے۔ البتہ مسلمانوں کا یہ خیال کہ ریاست کے دینی اور سیاسی وظائف الگ ہونا چاہئے مغرب کے اس تخیل سے بالکل مختلف ہے جسکا تعلق ریاست اور مذہب کی علیحدگی سے ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ صرف وظائف کی تقسیم ہے جسکے ماتحت اسلامی ریاستوں میں رفتہ رفتہ شیخ الاسلام اور وزراء کے عہدے قائم ہوتے۔ برعکس اسکے یورپ کی نظر فلسفیانہ اعتبار سے روح اور مادے کی ثنویت پر ہے۔ مسیحیت کی ابتداء ایک نظام رہبانیت کی شکل میں ہوئی تھی جسے امور دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن اسلام شروع ہی سے ایک ہیئت اجتماعیہ ہے جسکی بنا اگرچہ ان قوانین پر ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوئے مگر جن کی ماہیت سراسر دنیاتی ہے۔ بہت دن ہوئے امریکہ میں ایک کتاب "اگر مسیح شکاگو آئیں" شائع ہوئی تھی جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک امریکی مصنف ہی نے لکھا تھا۔

مسٹر اسٹیڈ کی تصنیف سے ہمیں جو سبق ملتا ہے وہ یہ کہ اس وقت نوع انسانی جن برائیوں کا شکار ہو رہی ہے ان کا ازالہ صرف دینی محسوسات ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ سر دست یہ فریضہ حکومت کا ہے کہ وہ ان خرابیوں کا استیصال کرے لیکن حکومت کا نظم و نسق خود ان سیاسی مشینوں کے ہاتھ میں ہے جنکے کل پرزے زنگ آلود ہو چکے ہیں۔ یہ مشینیں ان خرابیوں کا انسداد کرنا ہی نہیں چاہتیں ان میں اسکی صلاحیت بھی موجود نہیں۔ لہذا یہ امر کہ شہریوں کے اندر اپنے جماعتی فرائض کا احساس پیدا ہو صرف اس طرح ممکن ہے کہ خود ہمارے اندر ایک مذہبی بیداری رونما ہو جائے یہی ایک صورت ہے۔ کروڑ در کروڑ انسانوں کی ہلاکت و تباہی اور خود حکومت کو بربادی سے محفوظ رکھنے کی۔

لہذا مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں ریاست اور مذہب کی علیحدگی کا تعلق اصولیات سے نہیں بلکہ محض وظائف سے ہے۔ اسلام میں اس تقسیم کا مطلب کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ مسلمان اپنے قوانین میں

ان روحانی عقائد سے آزاد ہو جائیں جو صدیوں سے ان کے دل میں راسخ ہو چکے ہیں۔ بہر کیف تجربہ بتلادیگا کہ جدید ترکی میں اس کا اظہار کیونکر ہوتا ہے۔ خدا کرے ترک ان برائیوں سے محفوظ رہیں جو اس غلط روش کی بدولت آج یورپ اور امریکہ پر مسلط ہیں۔

اب تک جن اصطلاحات کی بحث تھی اس میں پنڈت جواہر لال کی نسبت زیادہ تر خطاب مسلمانوں سے تھا۔ پنڈت جی نے خصوصیت کے ساتھ جس چیز کی طرف اشارا کیا ہے وہ یہ کہ ترکی اور ایران میں وطنی اور نسلی تخیلات کا زور ہے۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ترک اور ایرانی اب مسلمان نہیں رہے۔ جن حضرات نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ اسلام کا ظہور اس وقت ہوا تھا جب اتحاد انسانی کے قدیم تخیلات مثلاً قرابت اور ملوکیت پرستی مٹ رہے تھے۔ لہذا اس نے اس اتحاد کی بنا گوشت اور پوست کے رشتوں کی بجائے نفس انسانی پر رکھی۔ حقیقت میں عمرانی لحاظ سے اسلام نے دنیا کو جو پیغام دیا وہ یہ ہے کہ نسل کا خیال چھوڑ دو ورنہ آپس کی لڑائیاں تمہیں ہلاک کر ڈالیں گی۔ یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہ ہوگا کہ اسلام کو فطرت کی یہ ادا کچھ بہت زیادہ پسند نہیں آئی کہ وہ انسان کو مختلف نسلوں میں تقسیم کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے مخصوص اداروں کی بدولت مسلمانوں کے اندر وہ مطمح نظر پیدا کیا جو حدود نسل سے آزاد اور لہذا فطرت کی اس تقسیم میں ہمیشہ حارج ہوتا رہتا ہے۔ اسلام نے صرف ایک ہزار سال کے اندر بنی نوع انسان کو جس طرح ایک عالمگیر برادری میں تبدیل کر دیا ہے بدھ مت یا مسیحیت نے دو ہزار سال میں بھی اسکی کوئی نظیر پیش نہیں کی۔ کیا یہ ایک معجزہ نہیں کہ ایک ہندی مسلمان مراکش پہنچکر بھی اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتا حالانکہ اسکی نسل اور زبان دونوں اہل مراکش سے الگ واقع ہوئی ہیں۔ بایںہمہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اسلام نے سرے سے نسل کا وجود تسلیم ہی نہیں کیا۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ اصلاح معاشرت میں اسکا اصول یہ رہا ہے کہ عصبیت نسل کو بتدریج ختم کرے تاکہ جہاں تک ممکن ہو ایک دوسرے سے تصادم نہ ہونے پائے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے انا جعلنکم شعوبا وقبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ لہذا نسل کا مسئلہ جس قدر اہم ہے اور انسان کو ان امتیازات سے نجات حاصل کرنے کے لئے جو طویل زمانہ درکار ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں ہمیں عقلاً اور عملاً وہی طرز عمل اختیار کرنا پڑے گا جو اسلام کا ہے۔ یعنی نسل کا اعتراف کرتے ہوئے خود نسلیت سے آزاد ہو جاؤ۔ سر آرتھر کائتھ کی مختصر سی کتاب

"مسئلہ نسل" میں ایک نہایت اہم عبارت ہے۔ جس کو یہاں پیش کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا۔

انسان کو اس امر کا احساس ہو رہا ہے کہ فطرت کا اولیں مقصد یعنی نسل آفرینی جدید معاشی ضروریات کے منافی ہے۔ لہٰذا وہ اس پریشانی میں ہے۔ کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ آیا فطرت کی نسل آفرینی کا خاتمہ کر دے اور اس طرح صلح و امن حاصل ہو یا فطرت کو اجازت دے کہ وہ اپنا عمل جاری رکھے اور اس سے جو نتیجہ مترتب ہوتا ہے ہوا کرے یعنی جنگ۔ انسان کو اپنے لئے ان دونوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اس کے بین بین کوئی صورت ممکن نہیں۔

لہٰذا ظاہر ہے کہ اگر اتاترک پر اتحاد تورانیت کا اثر غالب ہے تو یہ جذبہ اسلام کا اس قدر مخالف نہیں جتنا عہد جدید کے ان رجحانات کا اور اگر اتاترک کا واقعی یہ خیال ہے کہ نسل کے وجود کو ہر حال میں قائم رکھنا چاہئے تو اس خیال کو خود زمانہ مٹا دے گا کیونکہ اس کی یہ روش اسلام کے عین مطابق ہے۔ ذاتی طور سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مصطفےٰ کمال کو اتحاد تورانیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ محض ایک سیاسی جواب ہے اتحاد سلاف یا اتحاد الطانویت اور اینگلو سیکسن اتحاد کا۔

اگر اوپر کی عبارت سے کوئی خاص غلط فہمی پیدا نہ ہو تو یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں کہ انسان کے وطنی محسوسات کی طرف اسلام کا رویہ کیا ہے۔ اگر وطنیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان جس سرزمین میں پیدا ہوا ہے اس سے محبت رکھے بلکہ اگر ضرورت ہو تو اس کے ناموس پر اپنی جان دینے کے لئے بھی آمادہ رہے تو مذہب اسلام کو اس سے کچھ تعرض نہیں۔ اسلام سے اس کا تصادم صرف اسوقت ہوتا ہے جبہم وطنیت کو اتحاد انسانی کی اساس تصور کرتے ہوئے یہ مطالبہ کریں کہ مذہب کا دائرہ محض افراد تک محدود ہے قوموں کی زندگی سے اسے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن ایران، ترکی، مصر اور دوسرے اسلامی ممالک میں یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہاں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی ہے علاوہ ازیں بلاد اسلامیہ میں یہود، نصاریٰ اور زرتشتیوں کی جو اقلیتیں موجود ہیں اُن کو فقہ اسلامی کی رو سے "اہل کتاب" یا "شبہ اہل کتاب" تصور کیا جاتا ہے جن سے بروئے شریعت ہر قسم کے معاشرتی روابط یہانتک کہ ازدواج بھی جائز ہے۔ یہ مسئلہ صرف ان ممالک میں رونما ہوتا ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور وطنیت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے وجود کو اکثریت میں گم کر دیں بالفاظ دیگر اگر کسی ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے تو اسلام کو وطنیت پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ یہاں

ان کا وجود ایک دوسرے کا مرادف ہے۔ البتہ ان ممالک میں جہاں مسلمانوں کی اقلیت ہے اسلام کا تقاضا یہ ہوگا کہ بحیثیت ایک تمدنی وحدت کے مسلمان اپنے حق خود اختیاری سے کبھی دستبردار نہ ہوں گویا اسلام کا مطالبہ دونوں صورتوں میں ایک ہے۔

سطور بالا سے یہ امر بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام کی حالت کیا ہے اور اگر اس کا صحیح نقشہ ذہن نشین کرلیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ وحدت اسلام کی اساسات میں کوئی چیز خارج نہیں، نہ داخلی نہ خارجی، یہ وحدت جیسا کہ میں نے اس سے پہلے عرض کیا تھا اسلام کے دو بنیادی عقائد پر مبنی ہے۔ جنہیں پانچوں ارکان شریعت کا اور اضافہ کرلینا چاہئے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہماری وحدت کے یہ عناصر جناب رسالتمآب صلعم کے زمانہ مبارک سے لیکر اب تک جوں کے توں قائم ہیں اگر ان کو کسی نے توڑا تو ایران میں بہائیوں اور ہندوستان میں قادیانیوں نے۔ بہرکیف ہم اس اساس کی بنا پر تمام دنیائے اسلام میں عملاً ایک یکساں روحانی فضا قائم کرسکتے ہیں جس کے ماتحت اسلامی ریاستوں کا ایک سیاسی اجتماع بھی ممکن ہے خواہ یہ اجتماع ایک عالمگیر ریاست (مثالی) کی شکل اختیار کرے خواہ اسلامی ریاستوں کی ایک جمعیت کی یہ بھی ممکن ہے کہ متعدد اسلامی ریاستوں کا وجود قائم رہے اور وہ اپنے باہمی معاہدات میں سیاسی اور معاشی مصالح کا خیال رکھیں۔ اسلام ایک سیدھا سادا مذہب ہے اور اس نے اپنی ہیئت کا جو تصور کیا ہے وہ ہر زمانے میں اپنے لئے ایک راستہ تلاش کرلیتا ہے۔ اس امر کی تشریح کیلئے قرآن پاک کی چند آیات کی طرف اشارا کردینا ضروری ہے لیکن ایسا کرنے میں مجھے اپنے اصل مبحث سے ہٹنا پڑیگا۔ بہرکیف اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ سیاسی اعتبار سے ہماری وحدت ملی کا شیرازہ اسیوقت درہم برہم ہوتا ہے جب کوئی اسلامی ریاست دوسری اسلامی ریاست سے جنگ کرتی ہے اور مذہبًا یہ تفریق اس وقت رونما ہوتی ہے جب مسلمانوں کی کوئی جماعت اسلام کے اساسی مقاصد سے انکار کردے۔ چونکہ اسلام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی وحدت کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے اسے یہ گوارا نہیں کہ وہ اس قسم کی کسی بغاوت کا متحمل ہو۔ ہاں اسلام سے باہر یہ باغی جماعتیں ہر طرح کی روا داری اور حسن سلوک کی مستحق ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسوقت مسلمانان عالم ایک زبردست انقلاب میں سے گذر رہی ہیں۔ ہمارے سیاسی استحکام اور وحدت کی جو شکل ابتک قائم تھی اس کی بجائے۔ واقعات کسی دوسری شکل کے متقضی ہیں لیکن حالات اس قدر

تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ مستقبل کے متعلق کوئی پیشینگوئی کرنا دشوار ہے۔ رہا یہ امر کہ اگر کبھی دنیا کے سب مسلمان سیاسی اعتبار سے آپس میں مل گئے تو ان کا رویہ غیر مسلموں کی طرف کیا ہوگا یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب آگے چلکر خود زمانہ ہی دے سکتا ہے۔ میں صرف اتنا کہونگا کہ باعتبار اس جغرافی حیثیت کے جو اسلام کو یورپ اور ایشیا کے درمیان حاصل ہے اور بلحاظ اس امر کے کہ اس میں مشرق اور مغرب دونوں کے نصب العین حیات کا امتزاج ہو چکا ہے ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ یورپ اور ایشیا میں کوئی مقاومت ہو سکے۔ لیکن فرض کیجئے یورپ کی نادانیاں اسلام کو اپنی طرف سے برگشتہ خاطر کر دیں؟ اس کا جواب محض اس قدر ہے کہ یورپ کے موجودہ حالات اس امر کے مقتضی ہیں کہ اسلام کے متعلق اس نے جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہے اس کو بڑی حد تک بدل دیا جائے۔ ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ ناجائز معاشی فوائد کی ہوس اور سلطنت کے نشے میں اہل مغرب اپنی آنکھیں حقائق سے بند نہیں کر لینگے۔ بہرکیف ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے مسلمان کسی ایسے سیاسی تخیل کو قبول نہیں کرینگے جس سے اُن کی مخصوص تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہو جائے۔ اس سے قطع نظر کر لی جائے۔ تو ان پر مذہب اور حب الوطنی دونوں کی طرف سے جو فرائض عائد ہوتے ہیں۔ انکی بجا آوری کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور پیدا ہو جائے گا۔

دو ایک لفظ ہز ہائنس سر آغا خاں کے متعلق۔ پنڈت جی نے انکی ذات پر کیوں اعتراض کیا یہ ایک ایسی بات ہے جو ابتک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید ان کا یہ خیال ہے کہ اسماعیلیوں کا شمار بھی قادیانیوں ہی کے زمرے میں ہونا چاہیے ان کو غالباً یہ معلوم نہیں کہ اسماعیلیوں کی تاویلات دین کے بارے میں کتنی بھی غلط کیوں نہ ہوں انھوں نے اسلام کے بنیادی عقائد سے کبھی انکار نہیں کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تسلسل امامت کے قائل ہیں لیکن ان کا امام الہام وحی کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ وہ صرف قانون کا مفسر ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے سر آغا خان نے اپنی جماعت کو خطاب کرتے ہوئے (ملاحظہ ہو اسٹار الہ آباد، اشاعت ۱۲ مئی ۱۹۳۴ء) کہا تھا۔

> گواہ رہو کہ اللہ ایک ہے۔ محمد صلعم اس کے رسول ہیں۔ اور قرآن اس کی کتاب کعبہ ہم سب کا قبلہ ہے۔ تم مسلمان ہو۔ مسلمانوں ہی کے ساتھ رہو جب ان سے ملو تو السلام علیکم کہو۔

اپنے بچوں کے نام مسلمانوں کے سے رکھو۔ مسجدوں میں جاؤ اور مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کرو۔ روزے پابندی سے رکھو شادی بیاہ میں احکام نکاح پر عمل کرو۔ سب مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھو۔

اب یہ بات پنڈت جواہر لال نہرو کے دیکھنے کی ہے۔ کہ آیا سر آغا خان وحدت اسلامی کے طرفدار ہیں یا نہیں۔

---

# ضمیمہ ۱

علامہ ممدوح کا وہ بیان جو انھوں نے حالی قادیانی کشمکش کے دوران میں شائع فرمایا۔

## تنبیہ

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس بیان سے بعض حلقوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ میں نے دبی زبان سے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جبراً قادیانیت کو مٹا دے۔ ہرگز نہیں۔ میں نے اس امر کو بالکل واضح کر دیا تھا کہ ہندوستان کے فرمانروا صرف ایک ہی روش اختیار کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ امور مذہب سے مطلق تعرض نہ کریں۔ بایں ہمہ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ حکومت کی یہ روش ان جماعتوں کے لئے جن کی بنا مذہب پر ہے مضرت سے خالی نہیں۔ لیکن چونکہ اس سے بچنا ناممکن ہے لہٰذا جو لوگ اس طرح نقصان اُٹھا رہے ہیں ان کا فرض ہے کہ اپنی حفاظت کے لئے مناسب ذرائع اختیار کریں۔ میرے نزدیک حکومت ہند کے لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت قرار دے۔ انکا ایسا کرنا خود اہل قادیان کے طرز عمل کے عین مطابق ہوگا۔ اس کے بعد مسلمان بھی ان کو اسی رواداری اور بے تعصبی کی نظر سے دیکھنے لگیں گے جس طرح دوسرے مذاہب کو۔

محمد اقبال

اسوقت راسخ العقیدہ مسلمانوں اور اہل قادیان کے درمیان جو نزاع جاری ہے اس سے ایک نہایت ہی اہم مسئلہ رونما ہو گیا ہے اور مسلمانان ہند نے حال ہی میں اسکی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس مسئلے کے سیاسی اور اجتماعی پہلوؤں کے متعلق اہل برطانیہ کے نام ایک کھلا خط لکھتا لیکن افسوس ہے کہ خرابی صحت نے اس کی اجازت نہ دی۔ بہرکیف مجھے خوشی ہے کہ ایک ایسے معاملے کی تشریح میں جو میرے نزدیک مسلمانوں کی پوری جماعتی زندگی پر حاوی ہے چند الفاظ کہوں۔ لیکن مجھے شروع ہی میں یہ عرض کر دینا چاہیے کہ نہ میں کسی دینی بحث میں الجھنا چاہتا ہوں نہ مجھے نفسیاتی اعتبار سے بانی قادیانیت کی ذہنی حالت کا تجزیہ کرنا ہے اس لئے کہ جن حضرات کے لئے یہ تحریر لکھی جا رہی ہے ان کو اول الذکر یعنی دینی بحثوں سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی اور موخر الذکر — تحلیل نفسی — کا وقت ابھی ہندوستان میں نہیں آیا۔ لہٰذا ان سطور کو لکھتے ہوئے میں نے وہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے جو تاریخ اور ادیان و مذاہب کے طالب علم کا ہو سکتا ہے۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں زیادہ تر وہ قومیں آباد ہیں جن کی بنا مذہب پر ہے اور ملت اسلامیہ کا تعلق بہ نسبت اُن جماعتوں کے جن میں دینی اور نسلی دونوں خیالات کی آمیزش ہے مذہب سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ اسلام نے جذبۂ نسل کو مطلق تسلیم نہیں کیا اور اپنی اساس صرف مذہب پر رکھی۔ چونکہ اسلام کا دار و مدار مذہب پر ہے اور یہ مذہبی رشتہ خالصتاً روحانی لہٰذا شتہ قرابت سے کہیں زیادہ نازک واقع ہوا ہے اسلئے مسلمانوں کو فطرۃً ان باتوں کا بہت جلد احساس ہو جاتا ہے جو انمیں تفریق و انتشار کا باعث ہوں۔ پھر اگر ملت اسلامیہ کے اندر کوئی ایسی جماعت پیدا ہو جائے جو ایک جدید نبوت کی قائل اور تمام مسلمانوں کو محض اس لئے کافر سمجھتی ہے کہ وہ اس پر ایمان نہیں لاتے تو یہ ایک طبعی امر ہے کہ مسلمان اس کو حیات ملی کیلئے ایک خطرہ قرار دیں اور یہ اس لئے بھی کہ امت کا شیرازہ محض ختم نبوت سے وابستہ ہے۔

ختم نبوت کا تخیل غالباً ہم انسانوں کے افکار و تہذیب و شائستگی کی تاریخ میں بالکل اچھوتا اور نرالا ہے

اور اسکی صحیح اہمیت کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے وسطی اور مغربی ایشیا میں قبل اسلام کی مجوسی تہذیب کا بغور مطالعہ کیا ہے - اس مجوسی تہذیب میں جدید تحقیقات کی رو سے وہ سب تہذیبیں شامل ہیں جنکا تعلق زرتشتیت، یہودیت، اسرائیلی مسیحیت، کلدانی اور صابی مذاہب سے تھا - یہ مبنی بر عقائد ملتیں تسلسل نبوت کے خیال کو ضروری سمجھتی تھیں - لہذا ان کی زندگی ایک مسلسل انتظار کی حالت میں بسر ہوتی - بہت ممکن ہے کہ نفسیاتی اعتبار سے حامیان مجوسیت کو اس انتظار میں لطف آتا ہو لیکن آج کل کا انسان روحانی لحاظ سے ان سے کہیں زیادہ آگے نکل چکا ہے - مجوسی طرز خیال کا ایک ضروری نتیجہ یہ تھا کہ پرانی ملتیں مٹتی اور انکی بجائے طرح طرح کے مدعیان مذہب کے ہاتھوں آئے دن نئی جماعتیں قائم ہوتی رہیں - دنیائے اسلام میں بھی جاہل اور غرض پرست ملا جدید صحافت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے نہایت بے شرمی کے ساتھ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ قبل اسلام کے ان مجوسی تخیلات کو بیسویں صدی کے سر پر تھوپ سکیں - اب یہ ظاہر ہے کہ اسلام جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ تمام اقوام عالم کو ایک ملت میں شامل کرنے آیا ہے کسی ایسی تحریک کو گوارا نہیں کر سکتا جس سے اس کی وحدت میں فرق آئے اور جس کا مطلب یہ ہو کہ ابھی عالم میں کئی ایک اور ملتوں کا ظہور باقی ہے -

اس وقت قبل اسلام کے ان مجوسی خیالات کی جن دو شکلوں میں تجدید ہوئی ہے انمیں سے بہائی میرے نزدیک قادیانیوں سے کہیں زیادہ دیانتدار ہیں کیونکہ بہائیت نے کھلم کھلا اسلام سے علیحدگی کا اعلان کر دیا ہے - برعکس اسکے قادیانی اگرچہ ظاہرا اسلام کے پابند ہیں مگر ذہنا اس کی صحیح تعلیمات اور اغراض و مقاصد کے بالکل مخالف - یہ لوگ ایک انتقام پسند خدا کے قائل ہیں جو اپنے دشمنوں کے لئے طاعون اور زلزلوں کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ محفوظ رکھتا ہے - نبی کی حیثیت ان کے نزدیک کاہن کی سی ہے ۱ - اور روح مسیح کے تسلسل کا خیال ۲ - یہود کے عقائد سے اس درجہ مشابہ ہیں کہ تحریک قادیانیت کو گویا ابتدائی یہودیت کے احیا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۳ - البتہ مسیحی روح کے تسلسل کا خیال راسخ العقیدہ یہودیت کی بجائے یہودی تصوف کا پیدا کردہ ہے اور پروفیسر بوبر نے پولینڈ کے

---

۱ - چنانچہ خود بانی جماعت اور ان کے تمام "ملہم" مریدین کے الہامات محض پیشگوئیوں پر مبنی ہیں - قرآن مجید کے نزدیک نبوت کے فرائض تلاوت آیات، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس ہیں ---- مترجم

۲ - فلہذا "مثیل مسیح" کی اصطلاح ---- مترجم

۳ - اگلا صفحہ ملاحظہ ہو

مسیح علیہ السلام کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے "خیال یہ ہے کہ انبیا بلکہ نیک انسانوں (صادقین) کے ایک طویل سلسلے کی وساطت سے جس کا تعلق ہمارے زمانے سے بھی ہے۔ روح مسیحی کا نزول ہمیشہ زمین پر ہوتا رہتا ہے۔" یہ قبل اسلام کے انہی مجوسی خیالات کا اثر تھا کہ ایران میں جو ملحدانہ تحریکیں رونما ہوئیں انھوں نے عہد اسلامی میں "بروز"، "حلول" اور "ظل" کی اصطلاحیں ایجاد کیں تاکہ دوامی "اوتاریت ۴" کا عقیدہ ان کے اندر چھپا رہے۔ اگر مجوسی خیالات کے حامی ایسے نہ کرتے تو ظاہر ہے کہ اسلامی ذہنیت ان کو قبول کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہ ہوتی۔ "مسیح موعود" کی ترکیب بھی قبل اسلام کے مجوسی مطمح نظر کا نتیجہ ہے۔ اسلامی شعور دین سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی ابتدائی تواریخ میں اس کا کہیں ذکر نہیں آیا جیسا کہ پروفیسر ونسنک نے اپنی تصنیف "تطابق احادیث رسول صلعم" میں جو احادیث کے کم از کم گیارہ مجموعوں اور اسلامی تاریخ کی تین نہایت ہی قدیم دستاویزوں پر مشتمل ہے اس امر کو نہایت خوبی کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے۔ ہمارے لئے اس بات کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اسلام کے ابتدائی ادوار میں مسلمان اس اصطلاح سے کیوں متاثر نہیں ہوئے۔ غالباً وہ اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ الفاظ تاریخ کے ایک غلط تصور کا نتیجہ ہیں۔ مجوسی ذہن نے زمانے کا تصور حرکت محوری کے طور پر کیا ہے۔ یہ شرف صرف مشہور اسلامی مورخ اور مفکر ابن خلدون کے حصے میں آیا تھا کہ وہ اس کی صحیح حیثیت کو واضح کرتا یعنی یہ کہ زمانہ گویا تکوین تاریخ کی ایک تخلیقی اور بدیع حرکت ہے (ایک مسلسل روانی جس میں کوئی بازگشت نہیں۔ مترجم)

لہذا مسلمانان ہند میں قادیانیوں کے خلاف ناراضگی کی جو لہر موجزن ہے اس کو جدید عمرانیات کا طالب علم بخوبی سمجھ سکتا ہے اور جمہور اسلام جنکو "سول ملٹری گزٹ" کے ایک مضمون نگار نے "ملا پرست" قرار دیا ہے اس تحریک کے اس لئے مخالف ہیں کہ انہیں تحفظ ذات کی ایک فطری خواہش موجود ہے۔ یہ نہیں کہ ختم نبوت کی تہ میں جو خیال قائم کرتا ہے وہ اسکے مدعا و مطلب کو سمجھتے ہیں۔ نام نہاد

---

نوٹ ضمنی ۳۔ یوں بھی قادیانی اسرائیلی تاریخ کو اپنے لئے حجت سمجھتے ہیں۔ مثلاً ان کا یہ خیال کہ چونکہ یہودیوں میں جناب موسیٰ علیہ السلام کے بعد بہت سے انبیا پیدا ہوئے لہذا امت محمدیہ میں بھی "غیر تشریعی" پیغمبروں کا ظہور ہوتا رہے گا۔ مترجم

۴۔ "اوتاریت"، "بروزیت"، "ظلیت" و "حلولیت" یعنی بار بار اوتار بنکر آنا، تجدد و تلمم۔ ہم اس اصطلاح کے لئے فضلائے اردو سے معافی کے خواستگار ہیں۔ مترجم

"روشن خیال" مسلمانوں نے بھی تو ختم نبوت کی صحیح نوعیت کا اندازہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ برعکس اس کے "مغربیت" کے ایک تدریجی اور غیر مرئی عمل نے ان کے اندر دفاع ذات کا احساس بھی نہیں چھوڑا۔ ان "روشن خیال" مسلمانوں میں سے بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے بھائیوں کے متعلق "رواداری" سے کام لیں۔ ہم اس بات کو خوب سمجھ سکتے ہیں کہ سر ہربرٹ ایمرسن نے کیوں مسلمانوں کو رواداری کی تعلیم دی ہے۔ ایک جدید الخیال یوروپین کے لئے جس کی پیدائش اور تعلیم و تربیت ایک جداگانہ تہذیب میں ہوئی اس امر کی بصیرت کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ایسے مسئلے کی صحیح حقیقت کو سمجھ سکے جس کا تعلق ایک ایسی ملت کی موت و حیات سے ہو جو اپنی تہذیب و تمدن کا الگ اور جداگانہ تخیل رکھتی ہے۔

ہندوستان کے حالات عجیب و غریب ہیں۔ ادیان و مذاہب کا یہ ملک جہاں ہر ملت کا مستقبل خود اسکے اندرونی اتحاد و استحکام پر مبنی ہے ایک مغربی قوم کے زیر نگین ہے جس کے لئے سوائے اسکے چارہ کار نہیں کہ مذہبی امور میں عدم مداخلت کی روش اختیار کرے لیکن اس ضروری مگر آزاد خیال روش کا نتیجہ ہندوستان کے حق میں کچھ اچھا نہیں ہوا۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ کہنا کسی طرح بھی مبالغے میں داخل نہیں کہ ہندوستان میں دولت برطانیہ کے زیر حکومت مسلمانوں کی وحدت اس حد تک بھی محفوظ نہیں جس حد تک یہود اہل روما کے ماتحت۔ یہاں ہر مدعی مذہب کو موقعہ ہے کہ وہ اپنے فائدہ کے لئے ایک نئی امت پیدا کر سکے۔ ہماری آزاد خیال حکومت کو اس امر کی مطلق پرواہ نہیں کہ اس طرح کسی جماعت کا استحکام قائم رہتا ہے یا نہیں شرط یہ ہے کہ جو شخص کسی نئی مذہبی تحریک کا مدعی ہے وہ اور اس کے مرید حکومت کے وفادار ہوں اور ریاست کے تمام ٹیکس پابندی سے ادا کرتے رہیں۔ لسان العصر اکبر نے اس حکمت عملی کا مطلب خوب سمجھا تھا۔ انھوں نے اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں کہا ہے۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ　　انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

مجھے کثر ہندوؤں کا یہ کہنا نہایت ٹھیک نظر آتا ہے کہ ہندوستان کے آئندہ دستور میں انھیں مصلحین کے وجود سے محفوظ رکھا جائے حالانکہ یہ فرض مسلمانوں کا تھا کہ وہ اس قسم کا کوئی مطالبہ حکومت سے کرتے اس لئے کہ ان کا نظام معاشرت جذبۂ نسل سے بالکل آزاد ہے۔ حکومت کا بھی فرض ہے کہ موجودہ صورت حالات پر متانت کے ساتھ غور کرے اور ایک ایسے مسئلے کے متعلق جس کو جمہور اسلام بقائے

ملت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں انکی ذہنیت کو سمجھے۔ بہرکیف اگر کوئی قوم یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کا وجود خطرے میں ہے تو اسے مجبوراً ان قوتوں کا مقابلہ کرنا ہوگا جو اس میں تفریق و انتشار کا باعث ہوں۔

لہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے پاس دفاع ذات کے ذرائع کیا ہیں؟

اختلافی تحریریں اور اس شخص کے دعاوی کی تردید جو کسی جماعت کے اندر مذہبی اعتبار سے ایک نیا دعویٰ کھڑا کردے اگر یہ صحیح ہے تو ایک ایسی ملت کو رواداری کا سبق دینا کہاں تک مناسب ہے جس کا استحکام خطرے میں ہے۔ برعکس اسکے باغی جماعت کو اجازت دیجائے کہ وہ اپنا پروپیگنڈا جاری رکھے خواہ اس میں سب وشتم ہی سے کام لیا گیا ہو۔

لیکن اگر کسی جماعت کا ایک باغی فریق حکومت کے لئے خاص خدمات کا باعث ہو تو یہ اس کے اختیار میں ہے کہ جس طرح چاہے اس کی خدمات کا صلہ دے۔ اس پر کسی شخص کو اعتراض نہیں ہوگا البتہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم ان قوتوں سے جو ہمارے لئے تشتت و افتراق کا موجب ہو رہی ہیں اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ جماعتوں کے اندر بھی خطرات کا احساس ایسا ہی قوی ہوتا ہے جیسا افراد میں یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فرقہ ہائے اسلام کے دینی نزاعات کو اس کے بنیادی عقائد سے کوئی تعلق نہیں جن پر اختلاف رائے اور ایک دوسرے کی تکفیر کے باوجود ان سب کا ایمان ہے۔

لیکن ابھی ایک بات اور ہے جس پر حکومت کو غور کرنا چاہئے۔ اگر موجودہ آزاد خیالی کی بنا پر ہندستان میں مدعیان مذہب سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا تو اس سے لوگوں کے اندر رفتہ رفتہ مذہب سے بے اعتنائی پیدا ہوتی رہے گی اور اقوام ہند کی اجتماعی زندگی کا یہ سہارا ہمیشہ کے لئے مٹ جائیگا۔ اس وقت ہندی ذہن مذہب کی بجائے کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہوگا اور بہت ممکن ہے یہ وہی دہریت پرست مادیت ہو جس کا ظہور روس میں ہوا۔

---

## ضمیمہ، ب۔

مرزا بشیر الدین محمود احمد نے اپنے خطبۂ جمعہ میں کہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے علامہ اقبال کو حکومت سے اس امر کی شکایت ہے کہ اس نے مرزا صاحب کے خلاف وہی طرز عمل کیوں اختیار نہیں کیا جو رومی حکام نے مسیح علیہ السلام کے متعلق کیا تھا... گویا وہ رومیوں کے اس فعل کو مستحسن قرار دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں علامہ موصوف نے جریدۂ اسلام کے ایک خاص نامہ نگار سے فرمایا:۔

یہ قادیان کے فن غلط بیانی کا ایک خاص نمونہ ہے۔ مرزا محمود احمد نے میرے الفاظ کو وہ معنی پہنانے کی کوشش کی ہے جن کا خود مجھے بھی خیال نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے ان کو میری عبارت میں اپنے ہی خیالات نظر آتے ہیں۔ چونکہ انکی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میرے بیان کے اصل بحث کے متعلق کیا کہیں لہذا انھوں نے اپنے غریب متبعین اور شاید حکومت کو بھی اس غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر میرے نزدیک یہودی اہل روما کے زیر حکومت اس سے کہیں زیادہ محفوظ تھے جتنے کہ ہندوستانی مسلمان دولت برطانیہ کے ماتحت تو اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ میں رومی گورنر کے اس فعل کو کہ اس نے مجلس یہود کے فیصلے کی تصدیق کی اخلاقی اعتبار سے مستحسن سمجھتا ہوں۔ اس سے بڑی غلط بیانی کا شاید ہی امکان ہوسکتا تھا۔ اس لئے کہ مجھے اس امر کا خیال تک بھی نہیں تھا کہ رومیوں کے اس فعل کا اخلاق کی روشنی میں جائزہ لوں۔ برعکس اس کے میں نے موجودہ صورت حالات پر محض سیاسی اعتبار سے نظر ڈالی تھی۔ بحث طلب یہ ہے کہ رومی حکومت آئینی اعتبار سے اس بات پر مجبور تھی کہ ان تمام امور کے متعلق جن سے یہود کو انتشار ملی کا اندیشہ ہو مجلس یہود کے فیصلوں کی تصدیق کرے خواہ وہ ٹھیک ہوں یا غلط۔ یہ الگ بات ہے کہ مسیح علیہ السلام کے خلاف قانوناً جو کارروائی کی گئی اس میں بدقسمتی سے رومیوں کو بروئے آئین مجلس یہود کا ایک ایسا فیصلہ تسلیم کرنا پڑا جس کا تعلق ہمارے اعتقاد کے مطابق اللہ تعالےٰ کے ایک سچے نبی سے تھا۔ اگر یہ واقعہ کسی ایسے شخص کا ہوتا جو مذہب کو اپنی ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرتا تو رومیوں کے اس فعل پر

کہ انھوں نے مجلس یہود کے فیصلے کی تائید کی اخلاقاً کسی شخص کو تعرض نہ ہوتا۔ بایں ہمہ ہم اس تحفظ کی قدر وقیمت سے کیونکر انکار کر سکتے ہیں جو اہل روما نے یہود کو دے رکھی تھی۔ یہ جداگانہ امر ہے کہ اخلاقی اعتبار سے ہم اسکے متعلق مختلف رائے رکھتے ہوں۔ ممکن ہے ایک دن خود قادیانی بھی اس قسم کے تحفظ کا مطالبہ کریں کیونکہ انھوں نے شرعی اصطلاحوں کو جس طرح کھیل بنا رکھا ہے اس سے کئی ایک مدعیان نبوت کا ظہور بلکہ کامیابی ممکن ہوگئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کا حلقۂ اثر اتنا بڑھ جائے کہ جماعت احمدیہ کو اس سے خطرہ محسوس ہونے لگے۔ تعجب ہے کہ جس فرقے کا وجود اور کامیابی بجائے خود ایک جدید الخیال حکومت کی آزاد خیالی سے مترتب ہوئی وہ ہمارے اس مطالبے پر کہ ملت اسلامیہ کے استحکام کو مذہبی دعویداروں سے محفوظ رکھا جائے۔ خفگی کا اظہار کر رہی ہے۔

علیٰ ہذا میرے اس بیان کے متعلق قادیانی منطق پھر اس غلط نتیجے پر پہنچی ہے کہ میری تجویز کے مطابق حکومت برطانیہ کو چاہئے تھا کہ قادیانیت کو جبراً مٹا دیتی۔ میں نے اس امر کی صاف اور صریح طور پر وضاحت کر دی تھی کہ ہندوستان کے اندر جو خصوصیت کے ساتھ مذاہب و ادیان کا ملک ہے مذہبی معاملات میں عدم مداخلت کی روش ناگزیر ہے۔ میں خود آزاد خیالی کا کچھ بہت زیادہ معترف نہیں اور میرے نزدیک یہ عبارت ہے ان خیالات سے جن سے انسان اپنی صحیح حیثیت کھو بیٹھتا ہے بایں ہمہ میں نے اس امر سے کبھی انکار نہیں کیا کہ موجودہ دنیا میں رواداری ایک زبردست قوت ہے معلوم ہوتا ہے مرزا محمود احمد یا تو لفظ "ناگزیر" کا مطلب نہیں سمجھتے یا خواہ مخواہ اسے نظر انداز کر رہے ہیں۔

ممکن ہے دولت روما جناب مسیحؑ اور ان کے متبعین کو ایک نئی دینی جماعت تسلیم کر لیتی لیکن یہود کے تحفظ کا یہ طریق ممکن نہ تھا اس لئے کہ جب مسیح علیہ السلام کو پیلاطوس کے سامنے پیش کیا گیا ہے تو اس وقت کوئی شخص انکا پیرو نہ تھا دولت برطانیہ بہرکیف انتظامی لحاظ سے قادیانیوں کو ایک الگ اقلیت قرار دے سکتی ہے۔ میری دیانتدارانہ رائے میں صلح و امن کا یہی راستہ ہے۔ خود قادیانیوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت کے اندر رہنے کی خواہش نہ کریں جو ان کے نزدیک اسلام سے خارج ہے۔

---

# ضمیمہ ج۔

علامہ ممدوح کا وہ مراسلہ جو انھوں نے اسٹیٹسمین کے مقالہ افتتاحیہ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کے جواب میں تحریر فرمایا:۔

بخدمت ایڈیٹر صاحب اسٹیٹسمین

جناب والا ——— میں اس مقالہ افتتاحیہ کے لئے آپ کا شکر گذار ہوں جسے آپ نے ۱۴ مئی کی اشاعت میں سپرد قلم فرمایا۔ آپ نے جو سوال اُٹھایا ہے بیشک نہایت اہم ہے اور میں خوش ہوں کہ آپ نے ایسا کیا۔ میں نے اپنے بیان میں اس کا ذکر صرف اس خیال کی بنا پر نہیں کیا تھا کہ جب سے قادیانیوں کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ وہ ایک جدید نبوت کی بنا پر اپنی جماعت الگ طیار کریں اور جب انکے اس طرز عمل کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے جذبات شدت کے ساتھ برانگیختہ ہوگئے ہیں یہ فرض حکومت کا تھا کہ وہ سرکاری طور پر مسلمانوں اور قادیانیوں کے اس بنیادی فرق کا اعتراف کرتی۔ اس معاملے میں اُسے مسلمانوں کی طرف سے کسی باقاعدہ وکالت کا انتظار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میرے اس خیال کو حکومت کے اس طرز عمل کو دیکھتے ہوئے جو اس نے سکھوں کے متعلق اختیار کیا تھا اور بھی تقویت ہوئی۔ 1919ء تک سکھوں کو سرکاری طور پر ایک جداگانہ سیاسی جماعت تسلیم نہیں کیا جاتا تھا لیکن اس کے بعد انھیں بغیر کسی مطالبے کے خود بخود الگ کر دیا گیا حالانکہ لاہور ہائی کورٹ نے سکھوں کو ہندو ہی قرار دیا ہے۔

بہر کیف اب جب آپ نے یہ سوال اُٹھا دیا ہے میں ایک ایسے معاملے کے متعلق جو میرے نزدیک مسلمانوں اور اہل برطانیہ دونوں کے لئے بیحد اہم ہے چند باتیں عرض کرونگا۔ آپ مجھسے "اس امر کی وضاحت چاہتے ہیں کہ اگر کسی قوم میں دینی تفرقات رونما ہو جائیں تو کب اور کن حالات میں حکومت کا ان کو سرکاری طور پر تسلیم کر لینا مجھے ناگوار نہیں ہوگا۔" اس کا جواب یہ ہے۔

اولاً ملت اسلامیہ کی اساس خالصتاً مذہب پر ہے اور اس کے حدود بالکل معین۔ یعنی ایمان بالتوحید

ایمان بالانبیا اور اس بات کا اقرار کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ آخری عقیدہ حقیقتاً ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وہ حد فاصل ہے جس کے ماتحت ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا کوئی فرد یا جماعت ملت اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر برہمو خدا کے قائل ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبیوں میں سے ایک نبی سمجھتے ہیں با ایں ہمہ ہم ان کو مسلمان نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ اہل قادیان کی طرح وہ بھی تسلسل نبوت کو مانتے ہیں اور جناب رسالت مآب صلعم کو خاتم النبیین تصور نہیں کرتے۔ جہانتک میری معلومات کا تعلق ہے آج تک کسی اسلامی فرقے نے اس حد فاصل سے تجاوز نہیں کیا بہائیوں نے ایران میں کھلم کھلا عقیدہ ختم نبوت کا انکار کیا مگر ساتھ ہی اس بات کو بھی تسلیم کر لیا کہ وہ اصطلاحاً مسلمان نہیں بلکہ ایک نئی ملت ہیں۔ ہم مسلمانوں کے عقیدے میں اگرچہ اسلام اللہ تعالےٰ کا بھیجا ہوا دین ہے لیکن بحیثیت ایک قوم یا ملت کے اس کا انحصار محض حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت پر ہے۔ میرے نزدیک قادیانیوں کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں۔ بہائیوں کی تقلید یا ختم نبوت کا پورا پورا اقرار اور اس کی جملہ تاویلات کا خاتمہ۔ چونکہ سیاسی فوائد کی بنا پر ان کی یہ خواہش ہے کہ مسلمانوں میں ملے رہیں اس لئے وہ اس عقیدہ کی نہایت شاطرانہ تاویلیں کرتے رہتے ہیں۔

ثانیاً ہمیں اس طرز عمل کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے جو قادیانیوں نے دنیائے اسلام کے متعلق اختیار کر رکھا ہے۔ بانی قادیانیت نے ملت اسلامیہ کو "سڑے ہوئے" اور اپنی جماعت کو "تازہ دودھ" سے تشبیہ دی اور اپنے ماننے والوں کو ہدایت کی ہے کہ مسلمانوں سے میل جول ترک کر دیں۔ مزید براں ان کا اساسات سے انکار، بحیثیت جماعت ایک جدید نام (احمدیت) کا اختیار کرنا مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک نہ ہونا، ازدواج وغیرہ میں ان کا معاشرتی مقاطعہ اور بالخصوص یہ کہ اپنے سوا تمام عالم اسلام کو "کافر" قرار دینا یہ سب امور اس بات کی دلیل ہیں کہ خود قادیانی بھی اسلام سے الگ ہو جانا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان حقائق سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاید سکھ بھی ہندوؤں سے اس قدر دور نہیں جتنے قادیانی مسلمانوں سے کیونکہ سکھوں اور ہندوؤں میں رشتہ ازدواج جائز ہے حالانکہ سکھ ہندوؤں کے مندروں میں عبادت نہیں کرتے۔

ثالثاً اگر قادیانی اپنی دینی اور معاشرتی زندگی میں مسلمانوں سے علیحدہ رہتے ہوئے بھی سیاسی اعتبار سے ان میں شامل رہنا چاہتے ہیں تو اس بات کے سمجھنے کیلئے کسی خاص ذہانت کی ضرورت نہیں۔

مسلمان بسنکر انھیں سرکاری ملازمتوں کے حصول میں جو فائدہ پہنچتا ہے اس سے قطع نظر کیجئے تب بھی ان کی موجودہ تعداد کو دیکھتے ہوئے جو گذشتہ مردم شماری کی رو سے صرف ۵۶ ہزار ہے انھیں مجلس وضع قوانین میں کوئی نشست نہیں مل سکتی۔ گویا جن معنوں میں آپ سیاسی اقلیت کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ اقلیت بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود قادیانیوں نے بھی اس وقت تک سیاسی اعتبار سے اپنی جداگانہ حیثیت منوانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ انھیں خوب معلوم ہے کہ جمیعتہائے مقننہ میں وہ ایک نشست کے بھی مجاز نہیں۔ لیکن نئے دستور کے ماتحت ایسی اقلیتوں کا تحفظ بھی ممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ خود قادیانی کبھی حکومت سے علیحدگی کی درخواست نہیں کرینگے۔ البتہ مسلمان اس معاملے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ ان کو فوراً ہم سے الگ کر دیا جائے اور حکومت کا اس مطالبے کو منظور نہ کرنا گویا ہندوستانی مسلمانوں کے اندر یہ بدگمانی پیدا کرنا ہے کہ دولت برطانیہ نے اس جدید مذہب کو اپنے فائدے کے لئے محفوظ رکھا ہے اور ان کی علیحدگی میں اس لئے تاخیر کی جا رہی ہے کہ ابھی اس کے ماننے والوں کی تعداد نہایت کم ہے اور وہ پنجاب میں سیاسی اعتبار سے ایک چوتھی قوم نہیں بن سکتے جس سے مسلمانوں کی ذرا سی اکثریت جو انھیں مجلس وضع قوانین میں حاصل ہے کامیابی کے ساتھ ختم ہو جائے ۱۹۱۹ء میں حکومت نے سکھوں کی طرف سے اس بات کا مطلق انتظار نہیں کیا تھا کہ وہ باقاعدہ طور پر ہندوؤں سے علیحدگی کی خواہش ظاہر کریں۔ قادیانیوں کے معاملے میں انھیں اس قسم کی باقاعدہ نیابت کا کیوں انتظار ہے؟ — آپ کا....

محمد اقبال

## ضمیمہ ۱ د۔

حضرت علامہ کی طرف سے نمائندہ "ووٹر دنہ" کے بعض استفسارات کا جواب جس سے ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہوجاتا ہے جو قادیانی اور لاہوری فریق نے علامہ موصوف کے متعلق پھیلائی تھیں (صرف جوابات کا عنوان قائم کر دیا گیا ہے)

### ۱۔ حدیث مجدد

"میڈ لائٹ" نے ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ ہر صدی کے خاتمے پر ایک مجدد کا ظہور لازمی ہے۔ ذاتی طور سے مجھے اس بات کا یقین ہے کہ دنیا میں خدا کے نیک بندے ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے لیکن فطرت اس معاملے میں ریاضیات کی پابندی نہیں کرتی۔ تاریخ کی رفتار تعین و تحدید سے آزاد ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ہم عقلاً اس کی صحیح ماہیت کا اندازہ کر سکیں۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا راستہ پہلے سے مقرر نہیں۔ میری رائے میں ابن خلدون کا یہ نظریہ کہ وہ ایک تخلیقی حرکت ہے نہایت صحیح ہے اور موجودہ زمانے میں برگساں نے اس کو بہت زیادہ وضاحت اور صحت علم کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بہرکیف یہ حدیث جلال الدین سیوطی نے بیان کی ہے ... صحیحین یعنی بخاری و مسلم میں اس کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ ممکن ہے یہ انفرادی "واردات" ہوں مستقبل کے تاریخی مظاہر کے تصور کی لیکن اس کو حجت ٹھہرا کر یہ استدلال کرنا کہ چونکہ ایسا کہا گیا ہے لہذا ہر صدی پر ایک مجدد کا ظہور یقینی ہے صحیح نہیں۔ ائمہ حدیث کا اس بارے میں یہی مذہب ہے۔

### ۲۔ اسلام اور مجوسی اثرات

مجھے مسٹر ڈنشا (پارسیوں میں سے ایک صاحب جن کا خط اسٹیٹسمین میں شائع ہوا تھا) کے اس خیال سے کامل اتفاق ہے کہ تاریخ اسلام میں "ایرانیت" کا بہت زبردست عنصر موجود ہے۔ یہ ایرانی اثرات اس قدر وسیع ہیں کہ اشپینگلر نے غلطی سے اسلام کو بھی ایک مجوسی دین تصور کر لیا ہے۔ میں نے

تشکیل جدید" میں یہ کوشش کی تھی کہ اسلام پر مجوسیت کی جو تہیں جم گئی ہیں ان کو علیحدہ کر ڈالوں اور مجھے امید ہے کہ میں اپنی نئی تصنیف "مقدمہ مطالعہ قرآن" میں انشاء اللہ زیادہ کامیابی کے ساتھ ایسا کر سکونگا۔ اسلامی فلسفہ، دینیات اور تصوف میں مجوسی افکار اور مجوسیانہ واردات کی کثرت ہے۔ اور اس بات کی نہایت قوی شہادتیں موجود ہیں کہ تصوف کے بعض مذاہب نے صرف مجوسیانہ انداز کی مذہبی واردات کو دہرایا ہے میرے نزدیک مجوسی تہذیب بھی دنیا کی تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں اسے انسان کے لئے عار سمجھتا ہوں۔ مجوسی تہذیب پر بھی چند تصورات کی حکمرانی تھی، اسے بھی مخصوص فلسفیانہ مباحث پیش آئے اس میں سچائیاں بھی تھیں اور غلطیاں بھی۔ لیکن جب کسی تہذیب میں انحطاط و تنزل کے آثار رونما ہوتے ہیں تو اس کے فلسفیانہ مباحث اس کے تصورات اور مذہبی واردات کی شکلیں مقرر ہو جاتی ہیں۔ اسلام کا ظہور بھی ٹھیک اس وقت پر ہوا جب مجوسی تہذیب روبہ انحطاط تھی اور جہاں تک مختلف تہذیبوں کی تاریخ کو میں سمجھ سکا ہوں اس (اسلام) نے اس (مجوسی) تہذیب کے خلاف نہایت سختی کے ساتھ احتجاج کیا۔ قرآن پاک میں اس امر کے قطعی شواہد موجود ہیں کہ اسلام نے صرف علم و فکر کی دنیا ہی میں نہیں بلکہ مذہبی واردات کے اندر بھی نئے نئے مظاہر کا انکشاف کیا ہے، بہرکیف میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ مجوسیت سے ہمیں جو ترکہ ملا تھا وہ مسلمانوں کی زندگی اور اس امر میں برابر حارج ہوتا رہا کہ اسلام اپنی اصلی روح اور صحیح مقاصد کا اظہار کر سکے۔

## ۳۔ لفظ خاتم کے معنی

جریدۂ "سن رائز" کا ایک قادیانی مضمون نگار کہتا ہے کہ ایک ولندیزی خاتون نے جب اپنے ملک کے مشہور مستشرق پروفیسر ہرخورنجی — قادیانی کا مبلغ علم یہ ہے کہ وہ لکھتا ہے — سے لفظ خاتم کے معنی دریافت کئے تو انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کے اس کے متعلق دو مذاہب ہیں — ایک نے، خاتم کا ترجمہ 'آخری' اور دوسرے نے بھلا تو بن کیا ہے ...)

جہانتک، مجھے اسلامی دینیات کا علم ہے ان دو مذاہب کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ لفظ خاتم کے معنی کسی طرح بھی بہترین کے نہیں ہو سکتے خواہ لغت میں کتنی ہی موشگافیاں کی جائیں لیکن مرزا صاحب کے مریدوں کا تو غالباً یہ ... خیال نہیں۔ بہرکیف اگر وہ اس بحث پر قلم اٹھائیں اور

ان ائمہ کا حوالہ دیں جن کے نزدیک خاتم یا خاتَم کے معنی بہترین کے ہیں تو ہم ان کے بیحد شکر گذار ہونگے۔ (مدیر ٹروتھ کو یقین ہے کہ پروفیسر ہرخورنجی نے کبھی یہ الفاظ نہیں لکھے۔ کیوں نہ "سن رائز" ان کے خط کی نقل شائع کردے؟)

۴۔ "ٹھیٹھ اسلامی زندگی"۔

غالباً یہ ۱۹۱۱ء یا اس سے پہلے کا ذکر ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ آج سے پچیس برس پہلے مجھے احمدیت سے بہتر نتائج کی توقع تھی۔ اس سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم ایسے مقتدر مسلمان جنھوں نے اسلام پر انگریزی زبان میں متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں بانیٔ احمدیت سے اشتراک عمل کر چکے ہیں اور جیسا کہ مجھے معلوم ہے براہین احمدیہ کے بعض نہایت اہم حصے انہیں کے قلم سے نکلے۔ بہرکیف ایک مذہبی تحریک کے صحیح مفہوم کا ذرا دیر میں پتہ چلا کرتا ہے۔ بعض اوقات اس کے لئے برسوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ خود اس جماعت کے لاہوری اور قادیانی فرقوں کا اندرونی تنازعہ اس امر کی دلیل ہے کہ بانیٔ احمدیت سے ذاتی تعلقات کے باوجود ان کو اسکے صحیح مفہوم و مدعا کا علم نہیں ہوا۔ ذاتی طور سے میرے دل میں اسی وقت بدگمانی پیدا ہوگئی تھی جب ایک جدید نبوت کے دعوے کے ساتھ ... تمام دنیائے اسلام کو کافر قرار دیا گیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے "جس چیز کا اندازہ کرو اس کی جڑ سے نہیں کرو۔ یہ دیکھو کہ اس کا پھل کیا ہے۔" اگر میں نے اپنے پچھلے طرز عمل کو بدل دیا ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔ یہ شرف صرف ان لوگوں کے حصے میں آیا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے زندگی اور بصیرت عطا کی ہے۔ اینٹ اور پتھر بیشک اپنا طرز عمل کبھی تبدیل نہیں کرتے۔

---

# طلوع اسلام کے متعلق معاصرین کی رائیں

اور ہوٹلوں کے کامن روم اور کتب خانوں میں جاری کرائے تاکہ نوجوانان اسلام میں شئون ملت اسلامیہ عمرانیات ملک اور فتار عالم کے سمجھنے کی صحیح صلاحیت پیدا ہو جائے۔

**الجمعیتہ دہلی** ـــــ پروفیسر سید نذیر نیازی کا ماہانہ رسالہ "طلوع اسلام" جس کا پہلا نمبر گذشتہ ماہ میں شائع ہوا ہے جدید رسائل میں ایک ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ نمایاں اس اعتبار سے ہے کہ اس کے سامنے ایک مستقل مقصد زندگی ہے جس کی تکمیل کے لئے وہ جدوجہد کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنے دائرہ بحث کو نظر کو "حیات ملیہ اسلامیہ" تک محدود کیا ہے جس میں دنیا بھر کی وسعتیں آگئی ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی ملی زندگی سے انسانی سرگرمیوں کا کوئی شعبہ خالی نہیں ہے۔ طلوع اسلام اسی حقیقت کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرنے کے لئے عالم وجود میں آیا ہے۔ طلوع اسلام نے غور و فکر کے لئے ایک صحیح معیار ملت کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس معیار پر اگر غور و فکر کا مادہ قوم کے اندر پیدا ہو گیا تو ہمارا انتشار بڑی حد تک دور ہو سکتا ہے۔ اور باوجود جزوی اختلافات کے ایک مشترک زاویہ نگاہ با آسانی پیدا ہو سکتا ہے

**پیغام صلح لاہور** ـــــ طلوع اسلام کے سامنے ایک خاص مقصد ہے۔ اس نے اپنے لئے موجودہ عام پست مذاق سے ایک علحدہ روش منتخب کی ہے۔ جس پر ہم اسے مبارک باد دیتے ہیں۔ وہ اس خیال کا داعی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلام کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ اس کا دل حزن و مایوسی سے مغلوب ہونے کی بجائے امیدوں اور امنگوں سے لبریز نظر آتا ہے۔ رسالہ کو متعدد مشہور اہل قلم کی اعانت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو اپنے نیک مقاصد میں کامیاب فرمائے اور خدمت دین کی زیادہ سے زیادہ توفیق دے۔

**جامعہ دہلی** ـــــ یہ ایک خالص اسلامی مجلہ ہے اور اس کے تمام عنوانات اسلامی مباحث پر مشتمل ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ پرچہ نہایت محنت اور سلیقے کے ساتھ ایک خاص اسکیم کو پیش نظر رکھکر مرتب کیا گیا ہے۔ یقین ہے کہ رسالہ سنجیدہ طبقے میں بہت جلد مقبولیت حاصل کرے گا۔

**اردو اورنگ آباد** ـــــ ہمیں رسالے کے علمی معیار کے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے۔ وہ یقیناً بلند ہے اور مستقل عنوانات میں مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔

# فرمائش نامہ

بخدمت مہتمم صاحب

## مجلۂ طلوعِ اسلام

**۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور**

جنابِ من

السلام علیکم۔ براہ عنایت میرا نام خریداران طلوع اسلام کی فہرست میں شامل کریجئے۔ سالانہ / ششماہی چندہ مبلغ پانچ / تین روپے کے لئے وی۔ پی ارسال کیجئے / بذریعہ منی آرڈر بھیجدیا گیا ہے ٭

مخلص

________________
دستخط

نام ________________
براہ کرم خوش خط اور صاف لکھئے۔

پورا پتہ ________________

________________

٭ سالانہ چندے کی صورت میں تین روپے اور ششماہی چندے کی صورت میں پانچ روپے کاٹ دیجئے۔ علیٰ ہذا وی۔پی، یا منی آرڈر

اگر جناب کو طلوعِ اسلام کی خریداری منظور ہو تو اس فرمائش نامے کو پُر کرکے روانہ فرمادیجئے۔
اس کاغذ کو تہ کرکے باہر تین پیسے کا ٹکٹ لگا دیجئے۔

٭ علیٰ ہذا وی۔پی۔ یا منی آرڈر جیسا آپ پسند کریں۔

Book Post

یہاں تین پیسے کا
ٹکٹ چسپاں کیجئے

۱۱۹

مہتمم صاحب

مجلۂ طلوع اسلام

۲۵ میکلوڈ روڈ

لاہور

25, Mcleod Rd.,

LAHORE.

مولینا عبدالماجد دریابادی مدظلہ میدان صحافت میں

# آپکا ذاتی اخبار

## سچ کے بجائے "صدق"

یکم مئی ۳۵ء سے ۲۰ پونڈ سفید چکنے کاغذ پر ہر مہینہ کی یکم۔ گیارہ اور اکیس کو شایع ہوتا ہے ہمکو معلوم ہے کہ وہ صاحب ذوق حضرات جو مولینا عبدالماجد دریابادی کے طرز انشاء کے عاشق ہیں اور آپکے مخصوص دلنشین طرز صحافت کیلئے آپ کے اخبار سچ کے بند ہونے کے بعد سے بیتاب تھے اس مژدہ کو صحیح معنوں میں مژدہ سمجھیں گے لیکن چونکہ ہمارے پاس اخبار سچ کے خریداروں کی مکمل فہرست موجود نہیں ہے اس وجہ سے ہم فرداً فرداً خریداران سچ کو نمونہ روانہ نکر سکے۔ لہذا اشا یقین حضرات اپنا اپنا چندہ قیمتی چار روپیہ جلد از جلد روانہ فرما کر خریداران رجسٹر میں اپنا نام درج کرالیں ورنہ بعد کو پچھلے پرچے دستیاب نہ ہونے پر پچھتانا پڑے گا۔

"صدق" ہر اعتبار سے سچ سے بڑھا ہوا ہی معنوی حیثیت سے مضامین قرآنی کا اضافہ۔

## سالانہ چندہ

للعہ/

ترسیل زر بنام منیجر اخبار "صدق" ۴۳ ہیوٹ روڈ لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ایل ۳۶۹۰

لاہور میں خرید و فروخت کی بہترین جگہ

۶۱۹

# دی یونائیٹڈ آکشن مارٹ

۲۵۔ میکلوڈ روڈ، لاہور

ہر قسم کا سامان، نیا اور پرانا فرنیچر، دریاں، چینی کے برتن وغیرہ وغیرہ نیلام

میں یا ویسے روزمرہ تشریف لاکر خریدیئے

یونائیٹڈ آکشن مارٹ میں سب سے بہتر اور سستی چیز ملتی ہے۔

۲۵۔ میکلوڈ روڈ، لاہور

طابع و ناشر سید نذیر نیازی۔ مطبوعہ جید الکٹرک پریس، بلیماران، دہلی۔
دفتر رسالہ طلوع اسلام قرول باغ نئی دہلی سے شائع ہوا

## چندہ

| | | |
|---|---|---|
| سالانہ | ═══ | پانچ روپیہ |
| ششماہی | ═══ | تین روپیہ |
| ممالک غیر سے | ═══ | آٹھ روپیہ |

فی پرچہ ۸/

مہتمم مجلہ طلوع اسلام قرول باغ نئی دہلی

# بقائے صحت کے لئے ایک اچھی دوا

# اوکاسا OKASA

دماغی کام کرنے والوں کے لئے ایک بہترین چیز ہے

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے

اوکاسا کے استعمال سے جھریاں اور سفید بال نیست و نابود ہوجاتے ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے اضمحلال، چڑچڑاپن۔ نیز دوسری اعصابی بیماریاں

دور ہوجاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں

## اس سے پہلے کہ

بحالی قوت رفتہ کا وقت گذر جائے «اوکاسا» کا استعمال شروع کردیجئے

سوئکیوں کا بکس دس روپئے۔ آزمائش کے لئے ۳۰ ٹکیاں چار روپئے

---

اوکاسا کے اثرات سے مکمل فائدہ حاصل کرنیکے لئے ضروری ہے کہ نئی اور تازہ اوکاسا کی گولیاں استعمال کیجائیں اسکی شناخت یہی ہے کہ تازہ اوکاسا کے ڈبہ پر ایک سرخ فیتہ ہوتا ہے۔

---

اوکاسا ہر دوا فروش سے ملسکتی ہے یا ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں

اوکاسا کمپنی - برلن (انڈیا لمیٹیڈ) نمبر ۱۲ ریمپرٹ روڈ

پوسٹ بکس نمبر ۳۹۶ بمبئی

REGD. NO. L. 3690.


# SAHIH-AL-BUKHARI

**is now accessible to the English knowing world.**

Based on an intensive study of the Arabic language, early Islamic history and the Hadith-literature. With *Explanatory Notes* to help the reader to understand Islam. The chain of the narrators (Isnad) has been fully reproduced. An exhaustive *Index* will be added at the end.

**Printed on high quality antique paper with complete Arabic Text in 30 parts of 120 pages each.**

By

**MOHAMMAD ASAD (Leopold Weiss)**

| | | |
|---|---|---|
| ***Subscription Rates*** | *Inland* | ***Rs. 2/8/- per part*** |
| | *Foreign* | ***Sh. 4/-*** ,, |
| | *Postage Extra.* | |

صرف سر ورق جامعہ پریس میں چھپا

مطابع و ناشر سید نذیر نیازی - مطبوعہ جید الکشرک پریس ' بلیماران ' دھلی

# ISLAM AT THE CROSSROADS

*By* **MOHAMMAD ASAD**

(Leopold Weiss)

A BOOK EVERY MUSLIM MUST READ.

**Sir Mohammad Iqbal says—**

This work is extremely interesting. I have no doubt that coming as it does from a highly cultured European convert to Islam it will prove an eye-opener to our younger generation.

*Price Rs. 2/- net.*

***To be had of—***

***The Manager,***

**SHIRKATI TULU-E-ISLAM,**

**25, Macleod Road, LAHORE.**